40508

معاصر

مرتبہ

عبدالمنان بیدل

578

Essays — Urdu

بہ یادگار ڈاکٹر عظیم الدین احمد مرحوم

جلد ۲ حصہ ۸

U4
39

The J & K University Library
Acc. No. 40508

فہرست مندرجات معاصر

ALLAMA IQBAL LIBRARY
40508
CHECKED

آزاد نظم

از کلیم الدین احمد

انگریزی میں شاعروں کا ایک گروپ تھا جو امیجسٹ کے نام سے مشہور رہا ہے۔ ان شاعروں کا خیال تھا کہ ان کے عہد کی شاعری کھوکھلی اور مبہم سی چیز ہو گئی ہے جس میں کھوکھلے جذبات کی کھوکھلی نمائش کے سوا کچھ بھی نہیں۔ وہ نئی قسم کی شاعری کے خواہاں تھے جس میں یہ خامیاں نہ ہوں۔ اپنی نظموں میں وہ دو چیزوں کا خاص طور سے التزام رکھتے تھے۔ ایک تو یہ کہ کھوکھلے جذبات کے عوض کوئی ٹھوس قسم کا تصوّر یا پیکر، ٹھوس قسم کی تصویر یا تمثال ہو جو صاف صاف دکھائی دے۔ دوسری چیز یہ تھی کہ بنے بنائے بندوں کے عوض (جن میں وزن او رقافیے مل کر ایک خاص سانچہ بناتے اور اسی سانچے کی نظم میں تکرار ہوتی) وہ چاہتے کہ تجربہ اپنے سانچے آپ بنائے اور یہ سانچے ایک بند سے دوسرے بند میں تجربہ کے زیر و بم کے ساتھ بدلتے رہیں۔ اور اسی تجربے کے دباؤ سے بدلتے ہوئے سانچے کو آزاد نظم کہتے ہیں۔

اس گروپ کے شاعروں کا کہنا تھا کہ روایتی شعرا بنے بنائے سانچے استعمال کرتے تھے۔ ان سانچوں میں چار، چھ، آٹھ از قبیل مصرعے ہوتے، قافیوں کی ایک خاص ترتیب ہوتی، مصرعے چھوٹے بڑے بھی ہوتے مثلاً پہلے مصرع میں چار ارکان ہوتے تو دوسرے میں تین رکن ہوتے لیکن یہ سانچہ بن جانے کے بعد اسی کی تکرار ہوتی۔ نظم میں جتنے بھی بند (اسٹینزا) ہوتے وہ ایک ڈھنگ کے۔ اسی وجہ سے ایک دشواری ہوتی۔ تجربہ کو ایک حقیقت سمجھئے،

اس چشمہ کا پانی ایک طرح نہیں بہتا۔ کبھی تیزی سے بہتا ہے تو کبھی آہستہ۔ کبھی یہ ایسا زم سیر ہوتا ہے کہ جیسے "تصویر آب" ہو۔ کبھی ہلکی ہلکی لہریں ہوتی ہیں تو کبھی یہ لہریں بلند ہو جاتی ہیں۔ اور کبھی بھنور کی کیفیت ہوتی ہے۔ کبھی ہلکے ہلکے بلبلے بنتے ہیں اور بگڑتے ہیں تو کبھی جھاگ نظر آتی ہے۔ کبھی دھیمی سرسراہٹ کی آواز آتی ہے تو کبھی آواز کی لے تیز ہو جاتی ہے۔ غرض کہنا یہ ہے کہ تجربے میں ان گنت تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں اور ان تبدیلیوں کو بنے بنائے سانچے میں واضح کرنا ممکن نہیں۔ اسی لئے وہ کہتے ہیں کہ ہر تجربہ اپنا سانچہ آپ بناتا ہے اور آزاد نظم میں تجربے کی ان گنت ہونے والی تبدیلیوں کو دکھایا جا سکتا ہے۔ اس میں بنے بنائے سانچے کو توڑ مروڑ نہیں کرنا ہوتا ہے، تجربے کے دباؤ سے سانچہ بدلتا رہتا ہے اور ہلکی سے ہلکی تبدیلی سانچے میں دکھائی دیتی ہے۔

یہ کہنا درست نہیں کہ روایتی بندوں میں تجربے کی ہونے والی ان گنت تبدیلیاں واضح نہیں ہوتیں یا نہیں ہو سکتی ہیں۔ ایک ڈن کو لیجئے جو کافی پیچیدہ قسم کے بند استعمال کرتا ہے لیکن اس کی نظموں میں تجربوں کا زیر و بم، جذبات کا اتار چڑھاؤ، آواز کی نرمی یا بلندی، حرکت کی تیزی یا سستی، غرض ہلکی ہلکی تبدیلیاں جو برابر ہوتی رہتی ہیں ایسی واضح نظر آتی ہیں کہ آزاد نظم میں بھی تجربوں اور فورم میں اس سے زیادہ کامل ربط ممکن نہیں۔ روایتی قسم کے بندوں میں اس قسم کا کامل ربط مشکل ضرور ہے، آزاد نظم میں کچھ آسانی ہوتی ہے۔

آزاد نظم سے متعلق بہت سی ایسی باتیں کہی جاتی ہیں جن کا آزاد نظم سے کوئی خاص تعلق نہیں۔ "جدید نفسیات کے ماہروں نے ذہن لاشعور کو ناپنے کے لئے آزاد تسلسل کا طریقہ ایجاد کیا ہے۔ کسی شخص سے مخاطب ہو کر ایک فہرست میں سے منتخب الفاظ یا فقرے بولے جاتے ہیں اور اس سے کہا جاتا ہے کہ وہ ہر سوال کا جواب ان الفاظ یا الفاظ کے

مجموعے سے دے جو سب سے پہلے اس کے ذہن میں آئیں۔ ان جوابات سے اس فرد کی
زیرِ نفسی کیفیت کے متعلق نتائج مرتب کیے جاتے ہیں۔ شعر کی بھی ایک حد تک یہی کیفیت
ہے۔ شاعر کے دل میں ایک خیال اٹھتا ہے۔ پھر اس کا ذہن لاشعور اس خیال سے وابستہ
دوسرے خیالوں اور تصویروں کو کھینچ لاتا ہے اور انہیں شعر کی صورت میں منتقل
کر دیتا ہے... یہ تصویریں اتنی برق رفتاری سے ذہن لاشعور سے کھنچی چلی جاتی ہیں کہ
ان میں فوری طور پر کسی تسلسل کا اندازہ نہیں ہو سکتا۔"

شعر کی یہ کیفیت نہیں۔ اس قول میں صحت بس اسی قدر ہے کہ شاعر کے دل میں جو
خیال اٹھتا ہے وہ اس خیال سے وابستہ دوسرے خیالوں اور تصویروں کو کھینچ لاتا ہے۔
یہ خیالات، یہ تصویریں شعوری بھی ہو سکتی ہیں اور تحت الشعور سے بھی ابھر سکتی ہیں۔ لیکن یہ
چیزیں شعوری ہوں یا تحت الشعور سے ابھریں، یہ شعور کی زد میں آتی ہیں اور شاعر ان سے
شعوری طور پر کام لیتا ہے اور اپنے فنی کارنامے کی تکمیل کرتا ہے۔ اگر ان خیالوں اور
تصویروں میں ایسی برق رفتاری ہو کہ ان میں تسلسل باقی نہ رہے تو یہ فنی خامی ہو گی۔
یہ کہنا کہ یہ تصویریں تحت الشعور یا لاشعور سے بہت برق رفتاری سے ابھری ہیں، فنی
خامی کا جواز نہیں ہو سکتا۔ پھر یہ برق رفتاری تو دوسری صنفوں میں بھی مل سکتی ہے
آزاد نظم اس کی مخصوص جولاں گاہ نہیں۔ لاشعور کی طرح جنسیات کی بھی بات اٹھائی
جاتی ہے۔ میرا جی کہتے ہیں:۔

"بہت سے لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ زندگی کا محض جنسی پہلو ہی میری توجہ کا واحد مرکز ہے
لیکن یہ خیال صحیح نہیں۔ جنسی فعل اور اس کے متعلقات کو میں قدرت کی بڑی نعمت اور
زندگی کی سب سے بڑی راحت اور برکت سمجھتا ہوں۔ اور جنس کے گرد جو آلودگی تہذیب و

تمدن نے جمع کر رکھی ہے وہ مجھے ناگوار گزرتی ہے۔ اس لئے ردِّ عمل کے طور پر میں دنیا کی ہر بات کو جنس کے اس تصور کے آئینے میں دیکھتا ہوں جو فطرت کے عین مطابق ہے اور — جو میرا آدرش ہے"!

یہ کوئی نئی بات نہیں۔ ڈی۔ ایچ۔ لورنس بھی دنیا کی ہر بات کو جنس کے تصور کے آئینہ میں دیکھتا ہے۔ میرا جی کی توجہ کا واحد مرکز زندگی کا محض جنسی پہلو ہو یا نہ ہو۔ اس بات سے سر دست مجھے کوئی سروکار نہیں۔ مجھے صرف یہ کہنا ہے کہ لاشعور کی طرح زندگی کا جنسی پہلو بھی آزاد نظم کی ملکیت نہیں۔ یہ زندگی کا جنسی پہلو تو ادب میں دوسری جگہوں میں بھی ملتا ہے اس لئے آزاد نظم میں زندگی کے جنسی پہلو کا ہونا غیر متعلق سی بات ہے۔ یہ ہو بھی سکتا ہے اور نہ بھی ہو سکتا ہے اور اس کے ہونے نہ ہونے سے آزاد نظم کی ٹکنیک، اس کی اچھائی یا برائی پر کوئی روشنی نہیں پڑتی۔

ایک اور بات جو آزاد نظم سے متعلق کہی جاتی ہے وہ یہ ہے کہ آزاد نظمیں کسی حد تک مبہم اور نا قابل فہم ہوتی ہیں۔ "...... راشد کا محاورہ بھی ذاتی اور نفسیاتی ہے۔ اس کا جذباتی تسلسل ہم آہنگ اور آزاد ہے اور وہ منطقی ماحول جو وہ اپنی نظموں میں پیدا کرتا ہے، اکثر پڑھنے والوں کے لئے مبہم ہے۔ اور میرا جی کہتے ہیں۔

"بہت سے لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ میں صرف مبہم بات کہنے کا عادی ہوں، لیکن ذرا سا تفکر انہیں سمجھا سکتا ہے کہ بہت سی اور باتوں کی طرح ابہام بھی ایک اضافی تصور ہے اور پھر زندگی بھی تو ایک دھندلکا ہے 'ایک بھول بھلیاں' ایک پہیلی۔ اسے بوجھ نہ سکے تو ہم زندہ نہیں مردہ ہیں۔ مختلف انسانوں میں بصیرت کے مختلف درجے ہیں۔ اور بصارت کے مختلف طریقے انہیں حاصل ہیں۔ ان سے کام لینا ہی زندگی کا نام ہے"!

خیر یہ سب تو محض ہانی ہی باتیں ہیں۔ مجھے کہنا یہ ہے کہ نظموں کا مبہم اور ناقابل فہم ہونا، محاورے کا ذاتی اور نفسیاتی ہونا، بصیرت اور بصارت کے مختلف درجوں اور طریقوں کا ہونا۔ یہ اور اس قسم کی چیزیں آزاد نظم کی جاگیر نہیں۔ پابند نظمیں بھی مبہم اور ناقابل فہم ہوتی ہیں۔ براؤننگ کو لیجئے۔ بلیک کی "پروفیٹک" نظموں کو لیجئے۔ پھر نثر میں یہ سب چیزیں ہو سکتی ہیں۔ جیمس جوائس کی نثر میں جس حد تک یہ سب باتیں ملتی ہیں اس حد تک ایلیٹ اور پاؤنڈ کی نظموں میں بھی نہیں ملتیں۔ بات یہ ہے کہ اردو میں تقلید نو فطرت ثانی ہو گئی ہے۔ ایلیٹ پاؤنڈ وغیرہ کی نظمیں مبہم ہیں پھر اردو نظمیں کیسے مبہم نہ ہوں؟ آزاد نظم مبہم بھی ہو سکتی ہے اور بلّور کی طرح صاف و شفاف بھی اور مبہم ہونا آزاد نظم کی خصوصیت نہیں۔

میں نے اوپر کی سطروں میں جو باتیں کہی ہیں ان کا مقصد یہ ہے کہ ذرا امید ان صاف ہو جائے اور غیر متعلق باتیں بیچ میں نہ آنے پائیں۔ آزاد نظم کا جواز وہی ہے جو پابند نظم کا ہے۔ یعنی تجربے کا شاعر نے جس طرح بیان کیا ہے نہ کسی دوسری صورت میں ممکن نہ تھا۔ جو سانچے اس نے بنائے ہیں وہ کسی اندرونی ضرورت کا نتیجہ ہیں، جو تبدیلیاں سانچے میں دکھائی دیتی ہیں وہ تجربے کے دباؤ کی وجہ سے ہیں، اتفاقی نہیں، تجربے اور فورم میں ربط کامل ہے۔ لیکن اردو میں جو آزاد نظمیں لکھی گئیں اور لکھی جا رہی ہیں ان میں یہ باتیں نہیں ملتی ہیں۔ زیادہ سے زیادہ آزاد نظمیں قصداً لکھی جاتی ہیں اس لئے کہ اس قسم کی نظموں میں آسانیاں زیادہ ہیں۔ نالہ پابند نے نہیں ہوتا، فریاد کی کوئی لے نہیں ہوتی۔ ایک مثال سے یہ بات واضح ہو جائے گی۔ راشد کی نظم "دریچے کے قریب" کو لیجئے جو اس قسم کی نظموں میں اچھی شمار کی جاتی ہے:—

جاگ اے شمع شبستان وصال

مخملِ خواب کے اس فرشِ طربناک سے جاگ!
لذتِ شب سے ترا جسم ابھی چور سہی
آ مری جان مرے پاس دریچے کے قریب
دیکھ کس پیار سے انوارِ سحر چومتے ہیں
مسجدِ شہر کے میناروں کو
جن کی رفعت سے مجھے
اپنی برسوں کی تمنا کا خیال آتا ہے!

سیمگوں ہاتھوں سے اے جان ذرا
کھول مے رنگ جنوں خیز آنکھیں!
اسی مینار کو دیکھ
صبح کے نور سے شاداب سہی
اسی مینار کے سائے تلے کچھ یاد بھی ہے
اپنے بیکار خدا کے مانند
اونگھتا ہے کسی تاریک نہاں خانے میں
ایک افلاس کا مارا ہوا ملّائے حزیں
ایک عفریت — اُداس
تین سو سال کی ذلت کا نشاں
ایسی ذلت کہ نہیں جس کا مداوا کوئی!

دیکھ بازار میں لوگوں کا ہجوم
بے پناہ سیل کے مانند رواں
جیسے جنات بیابانوں میں
مشعلیں لے کے سرِ شام نکل آتے ہیں!
ان میں ہر شخص کے سینے کے کسی گوشے میں
ایک دُلہن سی بنی بیٹھی ہے
ٹمٹماتی ہوئی ننھی سی خودی کی قندیل
لیکن اتنی بھی توانائی نہیں
بڑھ کے ان میں سے کوئی شعلۂ جوالہ بنے
ان میں مفلس بھی ہیں، بیمار بھی ہیں
زیرِ افلاک مگر ظلم سہے جاتے ہیں!

ایک بوڑھا سا تھکا ماندہ سا رہوار ہوں میں!
بھوک کا شاہسوار
سخت گیر اور تنومند بھی ہے
میں بھی اس شہر کے لوگوں کی طرح
ہر شبِ عیش گزر جانے پر
بہرِ جمعِ خس و خاشاک نکل جاتا ہوں۔
چرخ گرداں ہے جہاں

شام کو پھر اسی کاشانے میں لوٹ آتا ہوں
بے بسی میری ذرا دیکھ کہ میں
مسجد شہر کے میناروں کو
اس دریچے میں سے پھر جھانکتا ہوں
جب انہیں عالم رخصت میں شفق چومتی ہے!

آزاد نظم میں اس بات کا آسانی سے التزام ہو سکتا ہے کہ باتوں میں تسلسل ہو، سطریں ایک دوسرے سے چسپاں ہوتی جائیں، غیر متعلق باتیں نہ آنے پائیں، خانہ پری نہ ہو، الفاظ کی ترتیب فطری ہو، لب و لہجہ گفتگو کا ہو۔ اب اس نظم کو پڑھئے۔ پہلی سطر میں لب و لہجہ وہی ہے، لفظوں کا چناؤ بھی وہی ہے جو روایتی اردو شاعری میں ملتا ہے:۔

جاگ اے شمع شبستان وصال
مخمل خواب کے اس فرش طربناک سے جاگ

پھر اس کا میل چوتھی سطر کے بے تکلف لہجے سے اچھا نہیں معلوم ہوتا۔ یہ بات بھی ظاہر ہے کہ دوسری سطر میں کوئی نئی بات نہیں کہی گئی ہے۔ جاگنا تو مخمل خواب کے فرش طربناک ہی سے ہو سکتا ہے۔ اور مخمل خواب کے فرش طربناک میں آورد کی نشانی ہے۔ پھر تیسری سطر جملۂ معترضہ سی معلوم ہوتی ہے۔ اس کی چنداں ضرورت نہ تھی۔ سب باتیں کہی نہیں جاتیں۔ اسی طرح اپنے برسوں کی تمنا کے خیال کو بھی چھپائے رکھنا چاہئے تھا۔ اس سے نظم کے ارتقا میں رکاوٹ ہوتی ہے۔ پھر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ "آمری جان مرے پاس دریچے کے قریب" کہنے کا کوئی اثر نہیں ہوتا۔ اور شمع شبستان وصال

مخمل خواب کے فرش طربناک سے نہیں جاگتی اس لئے پھر کہنا ہوتا ہے: سیمگوں ہاتھوں
سے اے جان ذرا کھول دے رنگ جنوں خیز آنکھیں! یا شاید شبستان وصال در نیچے کے
قریب آ جاتی ہے لیکن آنکھیں نہیں کھولتی اور آنکھیں شاید سٹ گئی ہیں جو انہیں سیمگوں
ہاتھوں سے کھولنا پڑتا ہے۔ اور پہلے اس نے مسجد شہر کے میناروں کو نہیں دیکھا تھا
اس لئے دوبارہ کہنا ہوتا ہے کہ 'اسی' مینار کو دیکھ ــــ اس یا اسی ہمــ جس کو پہلے
انوار سحر پیار سے چومتے تھے اور جواب صبح کے نور سے شاداب ہے۔ لیکن اصل غرض
مینار سے نہیں بلکہ اس ملائے حزیں (ایک عفریت ــــ اداس) سے ہے جو کسی تاریک
نہاں خانے میں اپنے بیکار خدا کے مانند اونگھتا ہے۔
لیکن ملائے حزیں تو کسی تاریک نہاں خانے میں چھپا بیٹھا ہے۔ اسے کیسے دیکھا
جائے؟ ــ اس لئے بازار میں لوگوں کے ہجوم کو دکھایا جاتا ہے اور "ہجوم" کافی نہیں
اس لئے یہ ہجوم "بے پناہ سیل" کے مانند بھی ہے اور بیابانوں میں جنات کے مانند بھی۔ ایک
تشبیہہ شاید کافی نہ تھی۔ پھر سیل بے پناہ اور بیابانی جنات میں کوئی لگاؤ نہیں ــــ
سیل بے پناہ تو آپ نے دیکھا بھی ہوگا لیکن بیابانوں میں جنات کو سر شام مشعلیں
لے کر نکلتے ہوئے شاید نہیں دیکھا ہوگا۔ تشبیہہ کی غرض یہ ہے کہ معنی واضح ہو جائے
لوگوں کا ہجوم تو اکثر دیکھنے میں آتا ہے لیکن جنات کا ہجوم دیکھنے میں نہیں آتا۔ جزئیات
بھی چسپاں نہیں ہوتیں، یہ لوگوں کا ہجوم صبح کو ہے (انوار سحر چومتے ہیں) جنات سر شام
نکلتے ہیں۔ پھر جنات مشعلیں لے کر نکلتے ہیں لوگوں کے ہجوم کے ہاتھوں میں مشعلیں نہیں۔
ہجوم بازار میں ہے جنات بیابانوں میں۔ اور ہجوم بے پناہ سیل کے مانند رواں ہے "
معلوم نہیں جنات کیسے رواں ہیں۔ بات یہ ہے کہ سیل بے پناہ اور جنات جملۂ معترضہ

ہیں۔ کہنا یہ ہے کہ ان میں ہر شخص کے سینے میں خودی کی قندیل ٹمٹماتی ہے۔ اور یہ خودی قندیل بھی ہے اور دُلہن بھی ۔۔۔ قندیل ٹمٹماتی ہے، دلہن ٹمٹماتی نہیں۔ قندیل شعلۂ جوالہ بن سکتی ہے، دلہن نہیں بن سکتی۔ دو استعارے خلط ملط ہو گئے ہیں۔

لوگوں کے ہجوم سے نظر اپنی طرف لوٹتی ہے۔ بھوک کا شاہسوار سخت گیر اور تنومند بھی (یہ شاہسوار کہاں ہے؟) اور بیچارا شاعر بوڑھا سا تھکا ماندہ سار ہوا ہے، 'بوڑھا سا'، بوڑھا نہیں ۔ 'تھکا ماندہ سا'، تھکا ماندہ نہیں۔ جو ہر شب عیش گزر جانے پر بہر جمع خس وخاشاک نکل جاتا ہے اور شام کو پھر اسی کاشانے میں لوٹ آتا ہے اور پھر مسجد شہر کے میناروں کو اسی دریچے سے جھانکتا ہے۔ فرق یہ ہے کہ اب ان میناروں کو انوار سحر نہیں چومتے، "عالم رخصت" میں، شفق چومتی ہے۔

راشد کچھ کہنا چاہتے ہیں۔ لیکن یہ باتیں دوسری طرح سے بھی کہی جا سکتی تھیں۔ اس قسم کی باتیں وہ اپنی ایک دوسری نظم "انسان" میں کہہ چکے ہیں:۔

الٰہی تیری دنیا جس میں ہم انسان رہتے ہیں
غریبوں، جاہلوں، مردوں کی بیماروں کی دنیا ہے
یہ دنیا بیکسوں کی اور لاچاروں کی دنیا ہے
ہم اپنی بے بسی پہ رات دن حیران رہتے ہیں!
ہماری زندگی اک داستاں ہے ناتوانی کی
بنا لی اے خدا اپنے لئے تقدیر بھی تو نے
اور انسانوں سے لے لی جرأت تدبیر بھی تو نے
یہ داد اچھی ملی ہے ہم کو اپنی بے زبانی کی!

ظاہر ہے کہ "دریچے کے قریب" میں کوئی نئی بات نہیں کہی گئی ہے۔ ہاں کہنے کا ڈھنگ نیا ہے، نیا سانچہ بنایا گیا ہے۔ لیکن اس سانچے میں فن کاری کا حسن نہیں۔ اسمیں بہت سے فروعات ہیں جن کی کوئی ضرورت نہیں۔ دیکھئے:-

آمری جان مرے پاس دریچے کے قریب
دیکھ! کس پیار سے انوار سحر چومتے ہیں
مسجد شہر کے میناروں کو
انہی میناروں کے سائے تلے کچھ یاد بھی ہے
اونگھتا ہے کسی تاریک نہاں خانے میں
ایک افلاس کا مارا ہوا ملائے حزیں
تین سو سال کی ذلّت کا نشاں
ایسی ذلّت کہ نہیں جس کا مداوا کوئی!
دیکھ بازار میں لوگوں کا ہجوم
ان میں ہر شخص کے سینے کے کسی گوشے میں
ٹمٹماتی ہوئی روشن ہے خودی کی قندیل
لیکن اتنی بھی توانائی نہیں
بڑھ کے ان میں سے کوئی شعلۂ جوالہ بنے
ان میں مفلس بھی ہیں بیمار بھی ہیں۔
زیر افلاک مگر ظلم سہے جاتے ہیں

میں بھی اس شہر کے لوگوں کی طرح
ہر شب عیش گزر جانے پر
بہر جمع خس و خاشاک نکل جاتا ہوں
شام کو پھر اسی کاشانے میں لوٹ آتا ہوں
مسجد شہر کے میناروں کو
اس دریچے میں سے پھر جھانکتا ہوں
جب انہیں عالم رخصت میں شفق چومتی ہے!

۴۲ سطروں کی جگہ اب صرف ۲۲ سطریں ہیں لیکن کوئی کام کی بات چھوٹ نہیں گئی ہے۔ تسلسل کچھ زیادہ ہے، نظم کچھ کم پھسپھسی ہو گئی ہے۔ لیکن پھر بھی کوئی بڑا کارنامہ نہیں۔ اور صرف یہی بات کہ ۲۰ سطریں نکال دینے سے تسلسل پر کوئی اثر نہیں پڑتا اس نظم کی فنی کمزوری کی سب سے بڑی دلیل ہے اور اس حقیقت کا اٹل ثبوت ہے کہ آزاد نظم کا سانچہ بنانا بہت مشکل ہے۔

بات یہ ہے کہ آزاد نظم میں بھی غزلیت کی لت نہیں چھوٹتی۔ توجہ کا مرکز شعر نہیں، پیراگراف ہو جاتا ہے اور آخر میں ٹیپ کا مصرعہ ہوتا ہے:۔ "اپنی برسوں کی تمنا کا خیال آتا ہے"۔ "ایسی ذلت کہ نہیں جس کا مداوا کوئی"۔ "زیر افلاک مگر ظلم سہے جاتے ہیں"۔ اس کے علاوہ جزئیات کے حسن پر نظر پڑتی ہے لیکن "فورم" کے حسن پر نہیں۔ مخمل خواب کا فرش طربناک، سیمگوں ہاتھ، بے رنگ جنوں خیز آنکھیں، جنات کا بیابانوں میں مشعلیں لے کر سر شام نکل آنا خود ہی کی قندیل کا دلہن سی بنی بیٹھنا۔ یہ سب اپنے اپنے رنگ میں خوش رنگ ہیں لیکن "فورم" کی رنگینی پر پردہ ڈال دیتے ہیں یہ نہیں کہ

"فورم" کے حسن کا خیال نہیں۔ اول نظم میں مسجد شہر کے مینار میں اور نظم انہیں میناروں پہ ختم ہوتی ہے۔ دوسری نظموں میں لفظوں اور مصرعوں کی تکرار سے اسی قسم کی حسن کاری کی کوشش ہوتی ہے لیکن کامیابی کم ہوتی ہے۔ اور وجہ یہ ہے کہ جزئیات کی اہمیت "فورم" کی اہمیت کو پس پشت ڈال دیتی ہے۔

میں نے کہا ہے کہ تجربے میں ان گنت تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں اور آزاد نظم میں ان گنت ہونے والی تبدیلیوں کو دکھایا جا سکتا ہے اس میں بنے بنائے سانچے کو توڑ مروڑ نہیں کرنا ہوتا ہے۔ تجربے کے دباؤ سے سانچہ بدلتا رہتا ہے اور ہلکی سے ہلکی تبدیلی سانچے میں دکھائی دیتی ہے۔ لیکن یہ کام آسان نہیں۔ اس کے لئے لطیف و نازک قوت حاسہ کی ضرورت ہے اور پھر ٹکنیک پہ پورا پورا قابو بھی۔ اردو نظموں میں سانچہ بدلتا ہے لیکن یہ تبدیلیاں تجربے کے دباؤ کی وجہ سے نہیں ہوتی ہیں۔ آزاد نظم کا ڈھونگ رکھنے کے لئے بڑی چھوٹی سطریں، بڑے چھوٹے مصرعے لکھے جاتے ہیں—— اگر مصرعے بڑے چھوٹے نہ ہوں تو پھر آزاد نظم کیسے ہو؟—— اور کبھی یہ تبدیلیاں اتفاقی ہوتی ہیں یا "اٹکل پچو" ہوتی ہیں۔ لیکن ان خارجی "تبدیلیوں اور اندرونی "تبدیلیوں میں کوئی لگاؤ نہیں ہوتا۔ اس لئے یہ تبدیلیاں بہت بھدی اور ناگوار معلوم ہوتی ہیں۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں:—

(۱) تیرے رنگیں رس بھرے ہونٹوں کا لمس

اور پھر "لمس طویل!"

جس سے ایسی زندگی کے دن مجھے آتے ہیں یاد

میں نے جواب تک بسر کی ہی نہیں

اور اک ایسا مقام
آشنا جس کے نظاروں سے نہیں میری نگاہ!

(۲) غم کا بحرِ بیکراں ہے یہ جہاں
میری محبوبہ کا جسم اک ناؤ ہے
سطح شور انگیز پر اس کی رواں
ایک ساحل، ایک انجانے جزیرے کی طرف
اس کو آہستہ لیے جاتا ہوں میں

دل میں یہ جاں سوز وہم
یہ کہیں غم کی چٹانوں سے نہ لگ کر ٹوٹ جائے!

(۳) اے مری ہم رقص مجھ کو تھام لے
رقص کی یہ گردشیں
ایک مبہم آسیا کے دور ہیں
کیسی سرگرمی سے غم کو روندتا جاتا ہوں میں

جی میں کہتا ہوں کہ ہاں
رقص گہ میں زندگی کے جھانکنے سے پیشتر
کلفتوں کا سنگریزہ ایک بھی رہنے نہ پائے

بڑی چھوٹی سطریں ہیں لیکن اٹکل پچو قسم کی۔" اور پھر ملس طویل" میں طالب علم کی سی ذہنیت ہے" جس سے ایسی زندگی کے دن مجھے آتے ہیں یاد" بھدا سا مصرع ہے۔ لفظوں کی ترتیب بھی فطری نہیں۔ اور باقی دو سطریں:۔

اور اک ایسا مقام
آشنا جس کے نظاروں سے نہیں میری نگاہ
غیر ضروری بھی ہیں اور بھدّی بھی۔ دوسری مثالوں کو لیجئے: یہ جہاں
غم کا بحرِ بیکراں ہے (اور) میری محبوبہ کا جسم اک ناؤ ہے (جو) اُس کی سطح شور
انگیز پہ رواں ہے۔ اس کو ایک ساحل، ایک انجانے جزیرے کی طرف میں
آہستہ لئے جاتا ہوں (اور) دل میں یہ جاں سوز وہم (ہے کہ) یہ کہیں غم کی
چٹانوں سے لگ کر ٹوٹ نہ جائے۔ نثر میں زیادہ سلاست ہے "میری محبوبہ کا
جسم اک ناؤ ہے" بہت گرا ہوا مصرع ہے۔ اور پوری تشبیہ میں آورد ہے، ثقالت
ہے، بھدّا پن ہے، کھینچ تان ہے۔ اور "دل میں یہ جاں سوز وہم" تو بہت ہی
کپس پھسا ہے۔ مضحک سا مصرع ہے۔ اور اثر تو خیر نام کو بھی نہیں۔ نظم کی یہ ناؤ
ٹوٹ ہی جائے تو اچھا ہے۔ تیسری مثال میں بھی یہی بے حسی ہے۔ "جی میں
کہتا ہوں کہ ہاں" ۔ جی میں بھی کہتے ہیں بر ملا بھی کہتے ہیں لیکن کہتے ہیں اثر
نہیں۔ غم بحرِ بیکراں ہو یا سنگریزہ، غم نہیں۔ اس لئے اس میں سوز نہیں، تڑپ
نہیں ـــــ اب ایک میراجی کی نظم دیکھیے۔ نظم کا نام ہے "ناداں"

یہ کیسے منظر ہیں، کیسی باتیں ہیں مجھ سے جو کہنا چاہتی ہو؟
سرود میں نے سنے ہیں پیڑوں کی ٹہنیوں سے
لچکتے نغمے،
فلک پہ بہتے ہیں بادلوں کے جو ننھے ٹکڑے۔
پھسلتے نغمے،

ہوا کے جھونکوں سے میرے کانوں نے سن رکھے ہیں
مچلتے نغمے،
مگر مجھے کچھ سمجھ نہ آئی۔

ہوا سے بادل کے چند ٹکڑے بہے چلے جا رہے تھے، میں نے
انہیں جو دیکھا تو میرے دل میں جھجکتی آشنا نے آہ بھر کر
کہا کہ یہ کیسی بات مجھ سے کہے چلا جا رہا ہے بادل؟
مگر مجھے کچھ سمجھ نہ آئی۔

مری نگاہوں نے شرم سے جھک کے دیکھا بہتی ہے ایک ندی
اور اس میں لہریں اور اس میں کچھ بلبلے سناتے ہیں ایک اچھوتا عجیب نغمہ
سرود میں نے سنے تھے پتوں سے، شاخ سے، ابر سے، ہوا سے،
مگر مجھے کچھ سمجھ نہ آئی۔

میں تنگ آ کر اٹھا اور اٹھ کر چلا اسی غم کدے میں پہنچا
مجھے جو لے کر گیا تھا ندی کی پھیلی پھیلی کھلی فضا میں
مگر وہاں بھی وہی تھے بادل سیاہ تاریک چپ ہٹیلے
وہاں تھی لہریں اداس باتوں کی، بلبلے تھے، کسی میں کوئی
نہ تھا دھندلکا،

مگر مجھے کچھ سمجھ نہ آئی۔

میں دیکھ کر اُن کو پوچھتا ہی رہا کہ آخر یہ بھید کیا ہے
یہ کیسے منظر ہیں کیسی باتیں ہیں، مجھ سے کیا کہنا چاہتے ہیں

اس نظم میں نیا سانچہ بنانے کی عمداً کوشش کی گئی ہے۔ اور اس سانچے میں تبدیلیاں بھی ہوتی رہی ہیں۔ پہلے پیراگراف سے دوسرا پیراگراف مختلف ہے۔ پھر یہ بات بھی کہ جملوں کے فطری ساخت، لفظوں کی فطری ترتیب اور وزن کے "باہمی کھیل" سے کام لیا گیا ہے۔ معانی اور جملے ایک سطر سے دوسری سطر میں کھنچ آئے ہیں۔ دوسرے پیراگراف کو لیجئے :-

ہوا سے بادل کے چند ٹکڑے بہے چلے جا رہے تھے، میں نے
انہیں جو دیکھا تو میرے دل میں جھجکتی آشا نے آہ بھر کر
کہا کہ یہ کیسی بات مجھ سے کہے چلا جا رہا ہے بادل ؟
مگر مجھے کچھ سمجھ نہ آئی۔

"میں نے انہیں جو دیکھا"، "آشا نے آہ بھر کر کہا"۔ لیکن "میں نے" پہلی سطر میں اور "انہیں جو دیکھا" دوسری سطر میں۔ آشا دوسری سطر میں آہ بھر کر تیسری سطر میں کہتی ہے۔ لب و لہجہ بھی گفتگو کا ہے۔ لیکن پھر بھی کامیابی نہیں۔ بات یہ ہے کہ ایک طرف تو جملوں کی فطری ساخت، لفظوں کی فطری ترتیب اور وزن کے "باہمی کھیل" سے کام لیا جاتا ہے اور دوسری طرف "لچکتے نغمے"، "پھسلتے نغمے"، "مچلتے نغمے"، تصنع کی جھلک دکھلاتے ہیں۔ پھر سطروں کی ساخت بھی اٹل نہیں۔

مثلاً تیسرے پیراگراف کو یوں لکھئے :۔

میں تنگ آ کر اٹھا اور اٹھ کر چلا،
اسی غم کدے میں پہنچا
مجھے جو لے کر گیا تھا ندی کی پھیلی پھیلی کھلی فضا میں
مگر وہاں بھی وہی تھے بادل
سیاہ، تاریک، چپ، ہٹیلے
نہاں تھی لہریں اداس باتوں کی،
بلبلے تھے،
کسی میں کوئی نہ تھا دھندلکا
مگر مجھے کچھ سمجھ نہ آئی۔
میں دیکھ کر ان کو پوچھتا ہی رہا کہ آخر یہ بھید کیا ہے
یہ کیسے منظر ہیں
کیسی باتیں ہیں
مجھ سے کیا کہنا چاہتے ہیں۔

اس طرح لکھنے سے معانی کچھ زیادہ واضح ہو جاتے ہیں۔ پہلی سطر میں شاعر تنگ آکر اٹھتا ہے اور اٹھ کر چلتا ہے اور غم کدے میں پہنچ بھی جاتا ہے۔ اسے توڑ دینے سے یہ لطیف بات حاصل ہوتی ہے کہ چلنے اور پہنچنے میں کچھ "دوری" ہو جاتی ہے، کچھ 'دیر' لگتی ہے۔ اور یہی ہونا بھی چاہئے۔ پھر دو چھوٹی چھوٹی سطروں کے بعد تیسری لمبی سطر پڑھنے سے ندی کی پھیلی پھیلی کھلی فضا کا احساس ہوتا ہے ـــــ

The J & K University Library
Acc. No. 40508

اسی طرح "سیاہ، تاریک، چپ، مٹیلے" کو بادل سے الگ کر دینے سے اثر کچھ زیادہ ہوتا ہے۔ اور بلبلوں کو الگ کرنے سے انہیں ایک لمحہ کی زندگی مل جاتی ہے۔ اور ایک ہی سانس میں "یہ کیسے منظر ہیں، کیسی باتیں ہیں، مجھ سے کیا کہنا چاہتے ہیں" کہنے کی ضرورت نہ تھی۔

کوشش ہوتی ہے لیکن سلیقہ نہیں آتا۔ سنئے:—

(۱) آج کی رات
میرا دل
چاہتا ہے تو بھی میرے پاس ہو
اور سوئیں ساتھ ساتھ

(۲) سفید بازو
گداز لتنے
زباں تصور میں حظ اٹھائے
اور انگلیاں بڑھ کے چھونا چاہیں مگر انہیں برقی ایسی لہریں
سمٹتی مٹھی کی شکل دے دیں

(۳) ترا دل دھڑکتا رہے گا
مرا دل دھڑکتا رہے گا
مگر دور دور!
زمیں پر سہانے لمحے آ کے جاتے رہیں گے
یونہی دور دور!

ستارے چمکتے رہیں گے
یونہی دور دور!
ہراک شئے رہے گی
یونہی دور دور!
مگر تیری چاہت کا جذبہ،
یہ وحشی سا نغمہ،
رہے گا ہمیشہ
مرے دل کے اندر
مرے پاس پاس

سلیقہ کی کمی روشن ہے۔ تکنیک خام ہے، ذہنیت طالب علم کی ہے۔ "اور سوئیں ساتھ ساتھ"۔ "دور دور"۔ "پاس پاس" مضحک سی چیز ہو کر رہ گئی ہے میراجی کی ایک نظم ہے "کلرک کا نغمۂ محبت"۔ پوری نظم نقل کرنے کی گنجائش نہیں۔ اس کا آخری پیراگراف ہے:۔

جب آدھا دن ڈھل جاتا ہے تو گھر سے افسر آتا ہے۔
اور اپنے کمرے میں مجھ کو چپراسی سے بلواتا ہے
یوں کہتا ہے، ووں کہتا ہے لیکن بیکار ہی رہتا ہے۔
میں اُس کی ایسی باتوں سے تھک جاتا ہوں
پل بھر کے لئے اپنے کمرے کو فائل لینے آتا ہوں،
اور دل میں آگ سلگتی ہے: میں بھی جو کوئی افسر ہوتا

اس شہر کی دھول اور گلیوں سے کچھ دور مرا بھی گھر ہوتا

اور تو ہوتی!

لیکن میں تو اک منشی ہوں تو اونچے گھر کی رانی ہے

یہ میری پریم کہانی ہے اور دھرتی سے بھی پرانی ہے!

اس میں نیا پن ہے، عصر حاضر کی جھلک ہے — کلرک کا نغمۂ محبت ہے۔ حقیقت طرازی بھی ہے — افسر، چپراسی، فائل کا ذکر ہے "تکنیک کی حسن کاری بھی ہے — "تھک جاتا ہوں تھک جاتا ہوں"، "اور تو ہوتی!" — کلرک کا نفسیاتی تجزیہ بھی ہے — "اور دل میں آگ سلگتی ہے"۔ لیکن نظم کچھ یوں ہی سے۔ مجھے معلوم نہیں کہ میراجی ایلیٹ کی مشہور نظم "دی لَو سونگ اوف ایلفرڈ پرِوفروک" سے واقف ہیں یا نہیں۔ اگر واقفیت کے بعد یہ نظم لکھی ہے تو یہ تو مبتذل سی نقالی ہے۔ بہر حال ان دونوں نظموں کا مقابلہ کرنے سے اچھی اور بری شاعری بلندی اور پستی — اور کیسی پستی! — کا حال معلوم ہوگا۔

میراجی کی تکنیک کی ناکامیابی کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ اکثر و بیشتر شاید میراجی کو بھی پتہ نہیں ہوتا کہ وہ کیا کہنا چاہتے ہیں۔ تکنیک تجربوں کی کامیاب ترجمانی کا ایک ذریعہ ہے۔ اگر تجربے صاف نہ ہوں تو تکنیک ان کی ترجمانی بھی نہیں کر سکتی۔ میراجی نے کہا ہے کہ "بہت سے لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ میں صرف مبہم کہنے کا عادی ہوں"۔ اور وہ اس بات پر فخر کرتے ہیں: "اکثریت کی نظمیں الگ ہیں میری نظمیں الگ ہیں۔ اور چونکہ زندگی کا اصول ہے کہ دنیا کی ہر بات ہر شخص کے لئے نہیں ہوتی، اس لئے یوں سمجھئے کہ میری نظمیں بھی صرف ان ہی لوگوں

کے لئے ہیں جو انہیں سمجھنے کے اہل ہوں یا سمجھنا چاہتے ہوں اور اس کے لئے کوشش کرتے ہوں۔" کسی نظم کا سمجھ ہی نہ آنا، اس کا مبہم ہونا اس کی اچھائی کی دلیل نہیں۔
سمجھ میں نہ آنے کی بہت سی وجہیں ہوسکتی ہیں۔ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ شاعر کا دماغ تیز رفتار ہوتا ہے اور پڑھنے والا پیچھے چھوٹ جاتا ہے، اسی تیز رفتاری کی وجہ سے وہ ایک بات سے دوسری بات تک پہنچ جاتا ہے اور بیچ میں جو دوری ہوتی ہے اسے ایک جست میں طے کرتا ہے۔ پڑھنے والا اس جست و خیز کا عادی نہیں ہوتا۔ موجودہ زمانہ میں ایک خاص وجہ یہ ہے کہ زندگی بہت پیچیدہ ہوگئی ہے، تجربے بھی بہت پیچیدہ ہوگئے ہیں۔ شاعر وسیع النظر ہوتا ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ پیچیدہ باتوں کو کم سے کم لفظوں میں کہدے اس لئے وہ اشاروں سے کام لیتا ہے۔ پڑھنے والوں میں یہ وسعت نظر نہیں ہوتی۔ وہ ان اشاروں کی تہہ کو نہیں پہنچ پاتے۔ مجھے کہنے دیجئے کہ میراجی کی نظموں میں ان دونوں باتوں میں سے کوئی بات نہیں۔ ان کا دماغ تیز رفتار نہیں، ان کے تجربوں میں کوئی خاص پیچیدگی نہیں اور ان کی نظروں میں کوئی خاص وسعت بھی نہیں۔ سمجھنے میں نہ آنے کی ایک وجہ یہ بھی ہوتی ہے کہ شاعر صاف طور پر سوچ نہیں سکتا۔ اس لئے اس کی باتیں مبہم ہوتی ہیں اور کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ اپنے خیالات کی ترجمانی کی قدرت نہیں ہوتی۔ سوچتا تو ہے لیکن باتیں صفائی سے نہیں کر پاتا۔ ان ہی دونوں وجہوں سے میراجی کی نظمیں مبہم سی ہوگئی ہیں۔ ان کی نظموں میں خیال نہیں، خیال کا دھندلکا ہے، جذبات کا دھواں ہے، لفظوں کا پھیلا ہوا کہرا ہے۔ اسی وجہ سے تکنیک میں کوئی نشان نہیں، کوئی بانکپن نہیں۔ باتیں کچھ ایسی گہری نہیں، پیچیدہ

نہیں، اتنی بھی نہیں کہ سمجھ میں نہ آئیں۔ لیکن ہم سمجھنا کیوں چاہیں، کوشش کیوں کریں جب اس کوشش کا ماحصل کچھ بھی نہیں۔

"اکثریت کی نظمیں الگ ہیں، میری نظمیں الگ ہیں"۔ ترقی پسند نظمیں اکثریت کی نظمیں ہیں۔ ترقی پسند شعرا بھی آزاد نظم سے کام لیتے ہیں۔ ان کی نظمیں صرف انہیں لوگوں کے لئے نہیں جو انہیں سمجھنے کے اہل ہوں، یا سمجھنا چاہتے ہوں اور اس کے لئے کوشش کرتے ہوں۔ وہ تو اس لئے لکھتے ہیں کہ ان کی باتیں آسانی سے عوام کی سمجھ میں آ جائیں۔ ان باتوں میں کوئی نیا پن نہیں، چند جانی ہوئی باتوں کی تکرار ہوتی ہے اس لئے سمجھنے کے لئے کوشش کرنے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ اور وہ آزاد نظم کی طرف شاید اس لئے جھکتے ہیں کہ وہ سمجھتے ہیں کہ اس "فورم" میں وہ اپنی باتیں آسانی سے عوام تک پہنچا سکتے ہیں اور ان کے جذبات کو بھڑکا سکتے ہیں۔ یعنی آزاد نظم سے بھی وہ وہی کام لیتے ہیں جو دوسری نظموں اور غزلوں سے۔ مضامین اسی قسم کے ہیں جن کی ترقی پسند شاعر سے امید رکھی جاتی ہے۔ خطابت ہے "دہکتی ہوئی تقریریں" ہیں شاعری نہیں۔ یہ چین کا سیلاب ہے:۔

اب یہ سیلاب بڑھتا چلا جائے گا
چین کی سرزمیں سے ملایا تلک
اور ملایا سے برما تلک
اور برما سے ہندوستان
اور ہندوستان سے فلسطین و یونان و اسپین تک
اب یہ طوفان چڑھتا چلا جائے گا

چین کے سرکشو، چین کے باغیو، مرحبا
اور آگے بڑھو، اور آگے بڑھو
وار پر وار کرتے چلو ....

یہ دہکتی ہوئی تقریر ہے نظم نہیں، اس میں گرج ہے شاعری نہیں۔ یہی گرج ہر جگہ ہے :-

شریف بہنو، غیور ماؤ
تمہارے بھائی
تمہارے بیٹے
تمہاری فریاد سن رہے ہیں
ملوں سے، کھیتوں سے، اور کانوں سے تم کو آواز دے رہے ہیں
وہ دیکھو ان کے جوان سینوں میں
عدل اور انصاف کی جوالا بھڑک رہی ہے۔

علی سردار جعفری تو ترقی پسندی سے مجبور ہیں۔ ان کی آزاد نظموں میں بھی "ترقی پسند" مضامین کا سیلاب ہے۔ مجھے ان مضامین سے سردست بحث نہیں، تکنیک سے بحث ہے لیکن ترقی پسند شعرا کو تکنیک کی حسن کاری کا زیادہ خیال نہیں اور اگر کچھ خیال ہے تو بس انہی چیزوں کا، انہی ترکیبوں کا جن سے وہ عوام کے جذبات کو بھڑکانے میں کامیاب ہو سکیں۔ "اور آگے بڑھو، اور آگے بڑھو" وہ مغربی شعرا سے سیکھتے ہیں۔ کہتے ہیں :-

اور میں پکار رہا ہوں

اور میرے ساتھ پبلو نرودا چلی کا جواں سال شاعر ہے
پیرس کا آتش نفس آراگوں ہے
سوویت یونین کا جوالا مکھی مایا کاوسکی ہے
لورکا، والٹ وہٹ مین،
گورکی اور پشکن
دانتے اور ہومر
سب ہم آواز ہیں۔

البیٹ کا ذکر تو ممکن نہ تھا۔ "بورژوا" اور "رجعت پسند" شاعر کا نام کیسے لیا جائے اور پھر اس سے کچھ سیکھنا تو گناہ ہے۔ تعجب ہے کہ پابلو نرودا آراگوں لورکا اور مایا کاوسکی سے کچھ کیوں نہیں سیکھتے۔ اگر ترقی پسندی اردو میں ایک پابلو نرودا ہی پیدا کرتی تو بڑی بات ہوتی اور پھر ہومر اور دانتے کیسے کھینچ آئے معلوم نہیں دانتے کی روح کیا کہتی ہوگی۔ دانتے کی تکنیک کی حسن کاری اور تکمیل تو کسی دوسری دنیا کی چیز ہے، ترقی پسندی کی پرواز سے بہت دور۔ علی سردار جعفری البیٹ کا نام نہ لیں لیکن البیٹ سے واقف ضرور ہیں۔ اگر وہ اس طرح توجہ کریں تو وہ البیٹ سے تکنیک کی حسن کاری سیکھ سکتے ہیں۔ لیکن وہ اس طرف توجہ کیسے کریں۔ حسن کاری اور ترقی پسندی میں ایک طرح کا بیر ہے۔

"آزاد نظم سے کم آزاد کوئی نظم نہیں" —— اردو شعرا اس حقیقت سے بے خبر ہیں۔ آزاد نظم آزاد بھی ہے اور پابند بھی۔ اردو میں اس کی آزادی سے ناجائز مصرف لیا جاتا ہے اور اس کی پابندیوں کی خبر بھی نہیں ہوتی۔ میں نے کہا ہے: ——

"تجربے کو ایک چشمہ سمجھیے۔ اس چشمے کا پانی ایک طرح سے نہیں بہتا۔ کبھی تیزی سے بہتا ہے تو کبھی آہستہ۔ کبھی یہ ایسا "نرم سیر" ہوتا ہے کہ جیسے "تصویر آب" ہو، کبھی ہلکی ہلکی لہریں ہوتی ہیں تو کبھی یہ لہریں بلند ہو جاتی ہیں اور کبھی بھنور کی کیفیت ہوتی ہے۔ کبھی ہلکے ہلکے بلبلے بنتے ہیں اور بگڑتے ہیں تو کبھی جھاگ نظر آتی ہے۔ کبھی دھیمی دھیمی سرسراہٹ کی آواز آتی ہے تو کبھی آواز کی لے تیز ہو جاتی ہے۔"

آزاد نظم میں سخت پابندی سے اس بوقلمونی کو برتا جاتا ہے۔ اردو میں اس سخت پابندی کا احساس نہیں ملتا۔
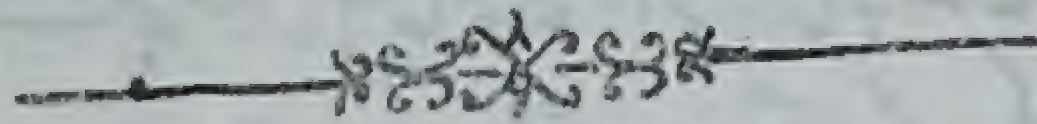
قاسم علی خاں آفریدی

از سید حسن

کراچی کے رسالہ "ماہ نو" بابت ماہ جون ۵۳ء میں جناب فارغ بخاری کا ایک مضمون بعنوان "سرحد میں اردو" شائع ہوا ہے جس میں انہوں نے صوبہ سرحد میں اردو کی پیدائش و ارتقا کا تذکرہ کرتے ہوئے قاسم علی خاں آفریدی کو صوبہ سرحد کا اردو شاعر بتایا ہے اور اس کے کلام سے چند اشعار بطور نمونہ نقل کیے ہیں۔ اس کے بعد 'ماہ نو' بابت جنوری ۵۴ء میں ضیا جعفری صاحب کا ایک مضمون اسی موضوع یعنی "سرحد میں اردو ادب" سے متعلق شائع ہوا ہے۔ ضیا جعفری صاحب نے فارغ بخاری صاحب سے زیادہ قطعیت کے ساتھ یہ دعویٰ کیا ہے کہ 'قاسم علی خاں سرحد میں اردو کا پہلا شاعر تھا۔ دونوں فاضل مضمون نگاروں کا ماخذ قاسم علی خاں آفریدی کا وہ قلمی دیوان ہے جو اسلامیہ کالج پشاور کی لائبریری میں موجود ہے۔ فارغ بخاری صاحب اس نسخہ کی کتابت کا سنہ ۱۸۲۰ء تحریر کرتے ہیں اور ضیا جعفری صاحب نے ۱۸۱۵ء لکھا ہے۔ اگر یہ دونوں صاحبان ایک ہی نسخہ کا حوالہ دیتے ہیں تو سنہ کتابت کے متعلق یہ اختلاف تعجب انگیز ہے۔

قاسم علی خاں آفریدی کی تصنیف کا ایک نسخہ کتاب خانہ خدا بخش پٹنہ میں بھی موجود ہے۔ یہ نسخہ قاسم علی خاں کے چھ جدا جدا رسائل کا مجموعہ ہے اور اس کا نام "رسائل آفریدی" ہے۔ اس میں مندرجہ ذیل چھ رسالے ترتیب وار شامل ہیں۔

(۱) رسالۂ آفریدی، (۲) شفاعت آفریدی، (۳) دیوان ہندی، (۴) آفریدی نامہ، (۵) دیوان پشتو" اور (۶) خواب نامہ۔

اس نسخے کی کتابت شروع سے آخر تک ایک ہی قسم کی ہے اور خط معمولی نستعلیق ہے۔ نسخے پر کئی جگہ مصنف کی مہر بھی ہے جس میں "قاسم علی خاں آفریدی سنہ ۱۱۹۱ھ" تحریر ہے۔ پوری کتاب میں جا بجا حاشیوں پر اور سطروں کے درمیان بھی جملے، سطریں اور اشعار اضافہ کئے گئے ہیں۔ بعض مقاموں پر تو نیا کاغذ چپکا کر پوری کی پوری سطر یا ساری غزل ہی بدل دی گئی ہے۔ یہ سب اضافے اور اصلاح اسی خط میں ہیں جس میں پوری کتاب تحریر کی گئی ہے۔ اس سے یہ گمان ہوتا ہے کہ یہ نسخہ خود قاسم علی خاں کے ہاتھ کا تحریر کردہ ہے۔ اس نسخے کے سن کتابت کا پتہ رسالۂ آفریدی سے چلتا ہے جو اس مجموعے کا پہلا رسالہ ہے۔ اس رسالہ میں ۲۳ باب ہیں۔ پہلے ۲۱ باب شہر جمادی الاول سنہ ۱۲۲۲ھ مطابق سنہ ۱۸۰۷ء میں مکمل ہو گئے تھے۔ اس کے بعد ۲۵ رمضان سنہ ۱۲۲۵ھ (= سنہ ۱۸۱۰ء) میں بائیسواں باب کا اضافہ کیا گیا ہے۔ اگرچہ اس مجموعے کے سب رسالے سنہ ۱۲۲۲ھ میں تمام ہو گئے تھے جیسا کہ خود مصنف کے بیان سے ظاہر ہے کہ "میں نے یہ چھ قطعے کتاب ۳۹ سال کی عمر میں تصنیف کئے تھے۔" لیکن اس کی کتابت سنہ ۱۲۲۵ء میں ہوئی ہے۔ اس رسالہ کا ۲۳ واں باب ۱۴ برس کے بعد یعنی سنہ ۱۲۳۹ھ مطابق سنہ ۱۸۲۳ء میں اضافہ کیا گیا ہے۔ اور اس باب کا خط عام انداز تحریر سے اس لحاظ سے تھوڑا فرق ہے کہ اسے جلد جلد لکھا گیا ہے۔

جیسا کہ اوپر تذکرہ ہو چکا ہے کہ اس مجموعے میں چھ رسائل شامل ہیں جن کی مجموعی ضخامت تقریباً ساڑھے چھ سو صفحے ہیں۔ کتاب کا سائز تقریباً "۱۲×۶" ہے۔

رسالہ آفریدی کی ضخامت تقریباً ۶۰ ورق ہے۔ رسالہ شفاعت آفریدی کے گیارہ ورق ہیں، دیوان ہندی کے ۱۰۶ ورق، آفریدی نامہ یا لغت آفریدی کے ۲۸ ورق، دیوان پشتو کے ۱۱۲ ورق اور خواب نامہ کے ۲۵ ورق ہیں۔

ان سب رسالوں میں رسالۂ آفریدی جو فارسی زبان میں ہے اہم ترین ہے۔ کیونکہ اس میں نہ صرف مصنف کے ذاتی اور خاندانی حالات مندرج ہیں بلکہ اس کے زمانے کے بہت سے تاریخی حالات بھی بیان کئے گئے ہیں۔ قاسم علی خاں ایک فوجی گھرانے سے تعلق رکھتا تھا، اس کے باپ، دادا اور خود اس نے دہلی اور اودھ کے حکمرانوں اور دکن کے مرہٹہ سرداروں کے یہاں مدت تک فوجی خدمت انجام دی تھی اور متعدد جنگوں میں حصہ لیا تھا، اس لئے اس کو بہت سے تاریخی واقعات کا ذاتی علم تھا جنھیں وہ تفصیل کے ساتھ اس رسالے میں بیان کرتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ رسالہ اس عہد کی تاریخ کا ایک مستند ماخذ ہے اور اس کے مطالعے سے نوابان اودھ، مرہٹہ سرداروں اور ایسٹ انڈیا کمپنی کے باہمی تعلقات پر واضح روشنی پڑتی ہے۔ یہ رسالہ اس عہد کی بعض تاریخی کتابوں مثلاً "عماد السعادت"، "تاریخ منظفری"، "سیرۃ المتاخرین" وغیرہ کا بہت ہی کارآمد ضمیمہ ہے۔ تعجب ہے کہ اس عہد کی تاریخ پر کام کرنے والوں نے اس وقت تک اس تصنیف کی طرف توجہ نہیں کی۔

رسالہ کے شروع میں مصنف نے تصنیف کی وجہ بیان کی ہے۔ افغانیوں کے یہاں قومیت کی بازپرس بہت زیادہ ہے خصوصاً آپس میں شادی بیاہ کے معاملے میں جد حقیقی وجد فاسد وغیرہ کا سوال اکثر درپیش ہو جاتا ہے۔ لہٰذا قومیت کی تشریح کے خیال سے مصنف نے آفریدی خاندان کی ابتدا اور دیگر حالات سے لوگوں کو

باخبر کرنے کے لئے یہ رسالہ فارسی زبان میں تالیف کیا ہے کیونکہ ہندوستان میں رہنے والے آفریدی لوگ پشتو زبان سے واقف نہیں ہیں۔ رسالہ کے ۲۱ ویں باب میں آفریدی نے اس بات پر زور دیا ہے کہ ہر آفریدی خصوصاً سلطان خیل قبیلے سے تعلق رکھنے والے آفریدی کو اپنے خاندان کا صحیح علم حاصل کرنے کے لئے اس رسالہ کا پڑھنا بلکہ اس کی ایک نقل رکھنا بہت ضروری ہے بلکہ یہاں تک لکھا ہے کہ جو اپنے کو آفریدی کہتے ہوں اور دیدہ و دانستہ اس کی نقل لینے سے اغماض و احتراز کرتے ہوں وہ ہرگز سلطان خیل آفریدی کے حلال نطفہ سے نہ ہوں گے۔

قاسم علی خاں، آفریدی قوم کے قبیلہ سلطان خیل سے تعلق رکھتا تھا۔ اس قبیلہ کا نام "سلطان خیل" اس لئے رکھا گیا تھا کہ "سیدل خیل" قبیلے میں ایک عورت مسمٰی سلطانی پیدا ہوئی جو جرأت و دلیری میں اکثر مردوں سے فائق اور شہرۂ آفاق تھی۔ یہاں تک کہ لوگ اس کے شوہر کے نام سے واقف نہ تھے اور اسی کے نام کو یاد کرنا کافی سمجھتے تھے۔ بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ سلطانی کے باپ اور شوہر دونوں ہی کا نام "سیدل خاں" تھا۔ سلطانی کا انتقال ستر سال کی عمر میں سنہ ۸۴۰ھ میں ہوا۔ اس عورت کی اولاد "سلطان خیل" قبیلے کے نام سے مشہور ہوئی۔ سلطانی کا ایک بیٹا یا پوتا منگلی خاں تھا جس کے دو بیٹے تھے۔ دولت خاں اور نظر خاں۔ نظر خاں کے بھی دو بیٹے تھے طاؤس خاں اور الف خاں۔ ان سب کا اصلی وطن "آخور گویا" نامی دیہات میں تھا جو کوہاٹ ضلع میں ہے۔ الف خاں پشاور میں سنہ ۱۰۱۱ھ (۱۶۰۲ء) میں پیدا ہوا تھا۔ یہاں پر قاسم علی خاں نے بتایا ہے کہ پشاور کا قدیمی نام "باگرام" تھا۔ الف خاں آخور گویا کے علاقے کا سردار بن گیا تھا اس لئے اسے "ملک" کہتے

معاصر

تھے۔ اس کا ۱۶۷۸ء (= ۱۰۹۰ھ) میں انتقال ہوگیا۔ اس کے پانچ بیٹے تھے۔
ایوب خاں، فتح خاں، جہان خاں، نیک نام خاں یہ چاروں بھائی ایک ماں کے بطن
سے تھے، پانچواں بھائی میر خاں دوسری منکوحہ بیوی سے تھا۔ ۱۱۱۵ھ میں ایوب خاں
جو سب بھائیوں میں بڑا تھا ہیضہ کی بیماری سے فوت ہوگیا۔ اس کی موت پر سب
بھائیوں کو بے حد غم ہوا اور انہوں نے طاؤس خاں کے بیٹے گوہر خاں کی صلاح اور
ہمراہی میں ہندوستان کو ہجرت کرنے کا ارادہ کرلیا۔ چنانچہ یہ لوگ ۱۰ ذی الحجہ
۱۱۱۸ھ کو ہندوستان کے لئے چل کھڑے ہوئے اور ۱۱۱۹ھ میں بادشاہ
اعظم شاہ غازی کے عہد حکومت کے پہلے سال اس ملک میں وارد ہوئے۔ پہلے تو کچھ
مدت تک شہر دھول پور باڑی مضاف صوبہ اکبرآباد میں مقیم رہے۔ پھر کچھ عرصے بعد
مؤرشیدآباد چلے گئے اور وہیں لال باغ کے مقام پر سکونت اختیار کی۔ اس زمانے میں
نواب برہان الملک سعادت خاں بہادر الہ آباد و اودھ کا صوبہ دار تھا۔ ان چاروں
بھائیوں نے اپنا کچھ مال و اسباب بیچ کر چند گھوڑے خرید لئے اور میاں خاں آفریدی
ملازم نواب کی وساطت سے نواب کی فوج میں ملازمت حاصل کرلی اور ان کی تعیناتی
فیروزآباد کے ضلع میں ہوئی۔ انہوں نے فیروزآباد میں اقامت اختیار کرلی اور
میاں خاں آفریدی کے ساتھ جس نے ان کو ملازمت دلائی تھی ایسے گہرے مراسم
اور برادرانہ روابط قائم ہوگئے اور پانچوں اس طرح مل جل کر رہنے لگے کہ لوگ
انہیں "پنج بھیا" کہنے لگے۔ اس زمانے میں نواب مظفر جنگ بہادر محمد خاں بنگش
بانی فرخ آباد، مؤرشیدآباد کا حاکم تھا۔ میاں خاں آفریدی نے کسی جھگڑے میں
نواب کے پانچ نوکروں کو جان سے مار ڈالا۔ انتقام کے ڈر سے میاں خان نے

فرخ آباد چھوڑ کر فیروز آباد میں سکونت اختیار کر لی۔ چاروں بھائیوں نے میاں خاں کا ساتھ دیا اور مئو چھوڑ کر فیروز آباد کو منتقل ہو گئے اور یہاں اپنی رہائش کیلئے پختہ مکانات بنوائے۔

تیسرے اور چوتھے بابوں میں قاسم علی خاں نے فتح خاں اور جہان خاں کی اولاد کا تذکرہ کیا ہے۔ پانچویں باب میں اس نے اپنے دادا نیک نام خاں اور اپنے باپ، دو چچاؤں اور ان کی اولاد پھر خود اپنی پیدائش کے حالات بیان کئے ہیں۔ نیک نام خاں اپنے آبائی وطن آخور کوتا میں سنہ ۱۰۸۰ھ (= سنہ ۱۶۷۰ء) میں پیدا ہوا تھا۔ اس کی تین منکوحہ بیویاں تھیں اور تینوں سے ایک ایک بیٹا تھا۔ پہلی بیوی سے کالے خاں گنگ، دوسری سے میران خاں اور تیسری سے برہان خاں یعنی قاسم علی خاں کا باپ۔ برہان خاں کی ولادت فیروز آباد میں سنہ ۱۱۲۹ھ (= سنہ ۱۷۰۶ء) کو شہنشاہ دہلی فرخ سیر کے عہد اور نواب صفدر جنگ فرمانروائے اودھ کے زمانے میں ہوئی تھی۔ برہان خاں کی شادی "اولاخیل" قبیلے کے ایک متمول گھرانے میں ہوئی تھی۔ قاسم علی خاں نے اپنے باپ کے حسن صورت، حسن سیرت اور علمی قابلیت کی بڑی تعریف کی ہے۔ برہان خاں نہ صرف فن سپہگری ہی میں ماہر تھا بلکہ اسے ادب و انشا سے بھی کافی دلچسپی تھی۔ اور افغانی (پشتو)، فارسی (اصفہانی)، ترکی اور ہندی (یعنی اردو مروجہ دارالسلطنت شاہجہان آباد دہلی) زبانوں میں بھی طاق تھا۔ اسی علم و دانش کی وجہ سے وہ ہندوستانی امیروں اور نوابوں کی محفلوں اور مجلسوں میں شریک ہوا کرتا تھا۔ فارغ بخاری صاحب نے اپنے مضمون مذکورہ بالا میں برہان خاں کی ولادت کی تاریخ اور ملازمت کا جو سبب بیان کیا ہے وہ غلط فہمی کا نتیجہ معلوم ہوتا ہے۔ انہوں نے برہان خاں کا سال ولادت

رسالہ کے چھٹے باب میں ۱۷۲۱ء بتلایا ہے۔ پیش نظر نسخے میں ۱۷۰۶ء مندرج ہے۔
نیک نام خاں کی وفات کی جو تاریخ دی گئی ہے اور اس وقت برہان خاں کا جو سن
بتلایا گیا ہے اس سے بھی برہان خاں کا سن پیدائش ۱۷۰۶ء ہی ثابت ہوتا ہے۔ نیک نام
خاں کی موت ۱۱۲۵ھ میں ہوئی اُس وقت برہان خاں کی عمر سولہ برس کی تھی۔ فارغ
بخاری صاحب نے بھی یہ بتایا ہے کہ برہان خاں کو اردوئے معلّی میں ماہر ہونے کی وجہ سے
دلّی میں شہنشاہ کے یہاں ملازمت ملی تھی اور اسے سرحد سے بُلواکر ماہر زبان کی
حیثیت سے ملازم رکھا گیا تھا۔ انہوں نے یہ استدلال کیا ہے کہ اس وقت سرحد میں اردو
اس قدر عروج پاگئی تھی کہ وہاں کے ماہر اردو' دہلی بلوائے جاتے تھے! فارغ صاحب کو
بہت زبردست مغالطہ ہوا ہے۔ برہان خاں فیروز آباد کا باشندہ تھا اُسے سرحد سے
محض اتنا لگاؤ تھا کہ اس کا باپ وہاں سے ہجرت کرکے ہندوستان چلا آیا تھا۔۔۔
اسے نواب قائم خاں بنگش مالک ملک متعلقہ فرخ آباد' کی ملازمت اُردو کے ماہر کی حیثیت
سے نہیں بلکہ ایک ماہر سپاہی کی حیثیت سے ملی تھی۔ بخاری صاحب کا یہ قول بھی محلّ نظر
ہے کہ "یہ زمانہ اس وقت کا ہے جب کہ دلّی میں اردو ابتدائی نشو ونما پارہی تھی"۔
فارغ صاحب کے اس جملے کا مفہوم واضح نہیں ہے۔ اگر اس کا مطلب یہ ہے کہ اس وقت
اردو دہلی میں بالکل ابتدائی منزل میں تھی تو یہ خلاف واقعہ ہے۔ یہ عہد دلّی میں اُردو کی
ترقی کا تھا۔ برہان خاں سودا کا ہمعصر تھا۔ اور ان سے چار برس پہلے پیدا ہوا تھا۔ سودا
نے ساٹھ پینسٹھ برس کی عمر میں فرخ آباد میں نواب بنگش کے یہاں کچھ مدت کے لئے قیام
کیا تھا۔ یہ زمانہ تقریباً ۱۱۷۰ھ کا تھا۔ اس وقت برہان خاں کے متعلقین فرخ آباد
میں رہتے تھے۔ کیا عجب ہے کہ برہان خاں نے سودا کو دیکھا ہو اور ان کے شعر وشاعری

ے دلچسپی لی ہو۔ غرض یہ کہ برہان خاں کی اردو دانی سے یہ نتیجہ نکالنا کہ سرحد میں اُس وقت اردو کافی ترقی کر چکی تھی صحیح نہیں معلوم ہوتا ہے۔

بہر حال، برہان خاں سپاہی ہونے کے علاوہ شعر و ادب سے بھی دلچسپی لیتا تھا۔ اس کے تین بیٹے تھے۔ ایک تو قاسم علی خاں مصنف رسائل آفریدی، دوسرے بندہ علی خاں، تیسرے اعظم خاں۔ قاسم علی خاں کی ولادت فرخ آباد میں ۲۰ رجب سنہ ۱۱۸۳ھ مطابق ۲۰ نومبر سنہ ۱۷۶۹ء کو (شاہ عالم بادشاہ کے جلوس کے دسویں سال) ہوئی تھی۔ برہان خاں کے بھائی کالے خاں گنگ کے تین بیٹے تھے، جعفر خاں، محمد علی خاں اور سید محمد خاں۔ برہان خاں کو اپنے بھتیجوں سے بڑی محبت تھی۔ وہ انہیں اپنی اولاد کی طرح مانتا تھا۔ یہاں تک کہ ان کی داڑھی مونچھیں نکل آنے تک بھی ان کی پرورش کرتا رہا۔ بلکہ جوان ہونے پر اپنا ایک ایک ہزار روپیہ خرچ کر کے ان کی شادی کرا دی اور بہت سا نقد اور گھوڑے، اسباب وغیرہ دے کر اپنے ذریعے سے ملازمت بھی دلوا دی۔ برہان خاں جب تک زندہ رہا ان بھتیجوں کے ساتھ شفقت و محبت کا سلوک کرتا رہا، لیکن قاسم علی خاں شکایت کرتا ہے کہ یہ تینوں بھائی احسان فراموش ثابت ہوئے۔

رسالہ کے چھٹے باب میں قاسم علی خاں نے اپنے باپ کے کچھ اور حالات بیان کئے ہیں۔ نیک نام خاں کی وفات سنہ ۱۱۴۵ھ میں ہوئی۔ اس کے دو تین سال بعد نواب محمد خاں بنگش "مالک ملک متعلقہ فرخ آباد" کا بھی انتقال ہو گیا، اور اس کا بیٹا نواب قائم خاں باپ کا جانشین ہوا۔ محمد شاہ بادشاہ غازی کے دربار سے اسے خلعت اور "فرزند خاں بہادر" کا خطاب عطا ہوا۔ نواب قائم خاں نے تجربہ کار اور با صلاحیت لوگوں کو ہر جگہ سے بلا بلا کر اپنے یہاں ملازمت دینی شروع کی۔ برہان خاں کو بھی

نواب صاحب کا مُہری اور دستخطی پروانہ طلبی کا ملا۔ چنانچہ وہ فیروز آباد سے مع متعلقین فیروز آباد چلا آیا اور یہاں قیام پذیر ہوا۔ اس وقت بُرہان خاں کی عمر اٹھارہ انیس سال کی ہوگی۔ اس کے سالے رستم خاں آفریدی (جو اولاخیل قبیلہ سے تھا) کی وساطت سے اسے نواب کے یہاں ملازمت مل گئی اور وہ نواب کے مقرب ملازموں میں شمار ہونے لگا۔ اسے دربار سے تین سو سواروں کی رسالہ داری اور خلعت نیز پالکی عطا ہوئی۔ مسند نشینی کے ساتویں سال نواب قائم خاں کو شہنشاہی حکم کے بموجب کٹیہر کے علاقہ میں روہیلہ افغانوں کی سرکوبی کے لئے مقرر کیا گیا۔ نواب نے انولہ اور بریلی کا رُخ کیا اور روہیلہ افغانوں کے ساتھ جنگ کرتے ہوئے شہید ہوگیا۔ نواب مرحوم کے بھائی نواب احمد خاں بہادر غالب جنگ نے رستم خاں آفریدی کی مدد اور مئو فرخ آباد میں رہنے والے افغانوں کی صلاح سے ملک مذکور کی وراثت کا دعوٰی کیا۔ نواب احمد خاں اور راجہ نول رائے نائب وزیر الممالک صفدر جنگ بہادر کے مابین جو جنگیں ہوئیں ان کا تذکرہ قاسم علی خاں نے بڑی تفصیل کے ساتھ کیا ہے۔ اس کی ساری ہمدردی نواب احمد خاں کے ساتھ ہے۔ لیکن نواب احمد خاں کو آخر میں شکست ہوگئی اور اسے بھاگ کر شمالی کوہستانوں میں پناہ لینی پڑی۔ قاسم علی خاں کا کہنا ہے کہ نواب احمد خاں کی شکست کی خبر سُن کر احمد شاہ دُرّانی نے قوم افغان کی ذلت وخواری کا بدلہ لینے کی غرض سے ہندوستان کا رُخ کیا اور فوج لے کر لاہور تک آ پہنچا۔ نواب وزیر الممالک صفدر جنگ کو احمد شاہ درّانی کی فوج کشی سے بڑی پریشانی لاحق ہوئی اور اسے مجبوراً نواب احمد خاں سے صلح کر لینی پڑی۔ چنانچہ فرخ آباد سے متعلق ساڑھے سولہ محالات نواب احمد خاں کے حوالے کر کے اس نے جنگ ختم کر دی۔ لیکن نواب احمد خاں کو

احمد شاہ درّانی کے لاہور پہنچنے کی کوئی خبر نہ تھی ورنہ قاسم علی خاں کا خیال یہ ہے کہ اگر اُسے یہ معلوم ہوتا کہ احمد شاہ درّانی افغانیوں کی شکست کا انتقام لینے آیا ہے۔ تو وہ کبھی مصالحت پر رضامند نہ ہوتا۔ اُدھر احمد شاہ درّانی بھی مصالحت کی خبر سن کر اپنے ملک کو واپس چلا گیا۔

مصالحت ہو جانے پر نواب احمد خاں کوہستانوں سے نکل کر فرخ آباد آ گیا اور اس علاقے پر حکومت شروع کی۔ قاسم علی خاں نے نواب کے ہوشمندانہ نظم و نسق، داد و دہش اور مردم شناسی کی بڑی تعریفیں کی ہیں۔

چھبیس برس کے بعد نواب احمد خاں کا انتقال ہو گیا۔ اس کا جانشین ہمت خاں مظفر جنگ ہوا۔ وہ ناتجربہ کار اور ناعاقبت اندیش تھا۔ اس نے افغانوں کو فوجی ملازمت سے برطرف کر کے ان کی جگہ نواب شجاع الدولہ کی طرف سے جو انگریز پلٹن بھیجی گئی تھی اُسے مقرر کر دیا۔ اور وزیرالممالک کی درخواست اور صلاح کاروں سے مشورہ کئے بغیر تحفہ و تحائف روزمرہ کے علاوہ اضلاع فرخ آباد کی تحصیل سے ساڑھے چار لاکھ روپیہ سالانہ زر نقد بطور خراج دینا منظور کر لیا۔ انگریزی فوج نے نواب مظفر جنگ کی اجازت سے فتح گڈھ میں جو فرخ آباد سے دو کوس کے فاصلے پر گنگا کے پار واقع ہے اپنا کیمپ قائم کیا۔ اس واقعہ پر قاسم علی خاں بہت ملال ظاہر کرتا ہے اور اسے ملک پر انگریزوں کے تسلط کا پیش خیمہ سمجھتا ہے۔

انگریزی فوج کے سپاہیوں نے افغانیوں کے ساتھ بہت ہتک آمیز سلوک کرنا شروع کر دیا تھا۔ چنانچہ افغانیوں کی ذلت کا ایک واقعہ جو برہان خاں کی زندگی میں اہمیت رکھتا ہے، قاسم علی خاں نے رسالہ میں نقل کیا ہے۔ ۱۱۸۷ھ میں ایک دن

برہان خاں اپنے کوشک پر دوستوں کی صحبت میں بیٹھا تھا کہ یکایک اس کی نظر شاہراہ پر جا پڑی - انگریزی فوج کے چند تلنگے ملازم کسی افغان کو جو قوم خٹک سے تھا ہاتھ پاؤں باندھ کر کیمپ کی طرف لئے جا رہے تھے اور راستے میں اس کے ساتھ بدسلوکی بھی کرتے تھے - افغانیوں کی اس ذلت و رسوائی کو دیکھ کر برہان خاں کا عیش منغص ہو گیا اور مارے غیرت کے اس کا برا حال ہو گیا - لیکن اپنی آبرو کے خیال سے اس نے ان تلنگوں کے ساتھ اس وقت تعرض کرنا مناسب نہ سمجھا اور قہر درویش بر جان درویش کے مطابق خاموش رہا - مگر اسی دن اس نے فرخ آباد کی سکونت ترک کرنے کا فیصلہ کر لیا - چنانچہ چند ہی دنوں کے بعد حویلی اور باغ کو چھوڑ کر مع متعلقین اور اپنے بھائی بندہ علی خاں کے ساتھ پچھم کی طرف روانہ ہو گیا - اس وقت قاسم علی خاں کی عمر چار سال اور بندہ علی خاں کی ایک سال تھی - کئی دن سفر کرنے کے بعد شاہجہاں آباد پہنچا اور یہاں سرکار نواب ضابطہ خاں کا ملازم ہوا - اسے قیبر خاں آفریدی کی شرکت میں دو سو سواروں کی سرداری ملی - کچھ مدت کے بعد شیر خاں سکھوں سے جنگ کرتے ہوئے مارا گیا - برہان خاں کو شیر خاں کی موت کا بہت صدمہ ہوا - عرصے سے اسے نواب کے یہاں سے دستے کے سواروں کی مقررہ تنخواہ بھی نہیں ملی تھی - بد دل ہو کر اس نے نواب ضابطہ خاں کی ملازمت سے استعفا دے دیا - اور شاہجہاں آباد چھوڑ کر چند ماہ جلال آباد لوہاری میں قیام کیا - قاسم علی خاں کا تیسرا بھائی اعظم خاں اسی جگہ پیدا ہوا - چالیس دن کے بعد موسم برسات میں یہ قافلہ پھر فیروز آباد کو چلا گیا - اور برہان خاں نے وہیں اپنے باپ کے بنائے ہوئے مکان میں رہائش اختیار کی - لیکن یہاں بھی ان کا قیام بہت دن

تک نہ رہا۔ ۱۱۸۸ھ کے موسم سرما میں برہان خاں فیروز آباد سے کوچ کر کے کوہار چلا گیا۔ جہاں ایک صدی پیشتر سے دیگر اقربا و متوسلین آباد تھے۔ یہاں اس نے ایک خام مکان اپنی رہائش کے لئے بنوایا۔ اور محمد سعید خاں اور عبدالرحمن خاں (پسران یوسف خاں قوم غلزئی قندھاری) کے کہنے سننے سے اور گردش روزگار سے مجبور ہو کر نواب وزیر الممالک کے یہاں چار گھوڑے لے کر ملازمت اختیار کر لی۔

کوہار ہی میں قاسم علی خاں اور بندہ علی خاں ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کے لئے مکتب میں بیٹھائے گئے۔ قاسم علی خاں نے اپنے استاد کا نام "حضرت شیخ الشیوخ جلیل الرحمن" بتلایا ہے جن کا وطن ملیح آباد تھا۔ اس نے ان ہی سے کلام اللہ اور فارسی پڑھی۔ برہان خاں شمالی کوہستانوں میں ہاتھی پکڑنے کے کام پر مامور تھا۔ آب و ہوا کی خرابی کی وجہ سے اس کی صحت بگڑ گئی اور مقام تحینانی کا شی پور سے بعارضہ فالج بیمار ہو کر کوہار لایا گیا۔ جہاں ۱۱۹۲ھ میں اس کا انتقال ہو گیا۔

باپ کے مرنے کے وقت قاسم علی خاں کی عمر ۱۱ سال تھی۔ برہان خاں جو کماتا تھا سب کا سب خرچ کر ڈالتا تھا۔ اس لئے اس کے مرنے کے بعد ایک تلوار، ایک اونٹ، دو گھوڑے اور کچھ اسباب جن کی مجموعی قیمت ایک ہزار روپیہ سے زائد نہ تھی، بیٹوں کو یہی چیزیں ترکہ میں ملیں جو گذر اوقات کے لئے کافی نہ تھیں، قاسم علی خاں کی یتیمی پر ترس کھا کر محمد سعید خاں بہادر قندھاری نے سرکار نواب وزیر الممالک کے یہاں ساٹھ روپیہ ماہانہ پر نوکری دلا دی اور اسے اپنے رسالہ

میں رکھ لیا۔

قاسم علی خاں نے ان قندھاری بھائیوں کی غربا پروری، دوست نوازی، شجاعت اور داد و دہش کی بہت تعریف لکھی ہے۔ ان ہی نیک اوصاف کی بدولت ان خان بھائیوں نے ساٹھ برس تک نواب صفدر جنگ، نواب شجاع الدولہ نواب آصف الدولہ، نواب وزیر علی خاں اور نواب سعادت علی خاں، پانچ وزیروں کے یہاں ملازمت کی اور ہمیشہ ہر معرکہ میں فتح و نصرت حاصل کی۔ بکسر کے مقام پر انگریزوں کے ساتھ لڑائی میں یہ دونوں بھائی شریک تھے۔

قاسم علی خاں کو ملازمت کئے ہوئے ابھی زیادہ دن نہیں گذرے تھے کہ ۱۱۹۴ھ میں نواب وزیر الممالک کے خواجہ سرا الماس نے قندھاری بھائیوں کے رسالے میں انتشار پھیلانا شروع کیا۔ خانان موصوف کے سب سردار تنخواہ نہ ملنے کی وجہ سے رسالہ چھوڑ چھوڑ کر ادھر ادھر چلے گئے۔ قاسم علی خاں نے بھی مرزا لطیف اللہ بیگ تحصیلدار پرگنہ ملیح آباد و مرزا عطا بیگ خاں نائب مرزا نو خندہ بیگ کے یہاں اپنے بھائیوں کے ساتھ نوکری کر لی اور انکی تعیناتی اکبر پور اور دولت پور کے علاقوں میں ہوئی۔ ۱۱۹۵ھ اور ۱۱۹۶ھ کے درمیان اس کو ہر ماہ کی تنخواہ وقت پر مل جایا کرتی تھی، لیکن نوجوانی کی ناعاقبت اندیشی کی وجہ سے جو کچھ ملتا تھا سب کا سب خرچ کر ڈالتا تھا۔

ان ہی ایام میں قاسم علی خاں کسی بت طناز کی تیر نگاہ کا شکار ہو گیا۔ معشوق بے وفا تھا جس نے اس کی محبت کی قدر نہ کی۔ اس واقعہ نے ایک سپاہی کے نرم و نازک احساسات میں تحریک پیدا کی اور اس کا سینہ جذبات و کیفیات کا

گنجینہ بن گیا جن کی ترجمانی کی خاطر اس نے شاعری شروع کی۔ قاسم علی خاں کی شاعری اسی پاک عشق کا نتیجہ ہے چنانچہ وہ خود لکھتا ہے۔

"از بوئش مشام معطر و اشواق تصنیف شعر و تلاش مضامین تازہ نو بنو از دست نرفتہ و انشاء اللہ تا دم زندگی نخواہد رفت۔ و کتب ہائیکہ تصنیف شدہ یا آئندہ ظہور خواہد شد بفضل عنایات الٰہی بتصدق ہماں معشوق بے وفا بظہور آمدہ"

سنہ ۱۱۹۷ھ میں قاسم علی خاں کی والدہ نے اس کی شادی کر لینے کا فیصلہ کر لیا۔ اور اسے مقام تعیناتی سے بلوا بھیجا۔ اس وقت قاسم علی خاں کے پاس ظروف نقرہ مروجہ کے علاوہ صرف ایک سو روپیہ زر نقد تھا۔ ماں کے حکم کے بموجب وہ قطع منازل کرتا ہوا کوہار پہنچا۔

اسی سال ملک میں قلت بارش کی وجہ سے زبردست قحط پڑا۔ آفریدی کا بیان ہے کہ غلّہ کی گرانی اور نایابی کی وجہ سے ہندوستان کے ہر گوشے میں صدہا آدمی بھوکوں مرنے لگے، یہاں تک کہ آدمی آدمی کا گوشت کھانے لگا تھا۔ گھاس اور چارہ نہ ملنے کے سبب بے شمار جانور بھی ہلاک ہو گئے۔ باغ و راغ میں ہر قسم کے درخت بھی خشک ہو گئے۔ پہاڑوں کے پتھر تپش آفتاب سے پارہ پارہ ہو گئے، بڑے بڑے دریا سوکھ کر نالے بن گئے۔ اس زمانے میں غلہ کا نرخ روپیہ میں نو سیر ہو گیا تھا اور بڑی مشکلوں سے دستیاب ہوتا تھا۔

بہر حال، شادی کا دن مقرر ہو چکا تھا، اس لئے اسے انجام پانا ہی تھا۔ قاسم علی خاں کا سسر زبردست خاں آفریدی فرخ آباد کا باشندہ تھا۔ قاسم علی

خاں کی بارات کو لہار سے فرخ آباد گئی اور وہ بیوی کو لے کر کولہار واپس آیا ــــ
اس اثنا میں عبدالرحمٰن خاں قندھاری فوج کے ساتھ دکن میں پرگنہ ہان کی پیشوا کی فوجوں سے جنگ کر کے فتح و نصرت حاصل کرنے کے بعد لکھنؤ لوٹ آیا۔ اسکی شجاعت کے صلے میں نواب وزیر الممالک آصف الدولہ آصف جاہ یحییٰ خاں بہادر ہزبر جنگ نے قندھاری خانوں کو بہت سا انعام و اکرام عطا کیا تھا اور اس کے رسالہ کے سواروں کی تعداد میں اضافہ کر کے دو ہزار کر دی تھی۔ آفریدی کی پٹھانے تعلقات کی بنا پر مرزا عطا بیگ خاں کے رسالے سے نکل کر پھر محمد سعید خاں بہادر قندھاری کے رسالے میں شامل ہو گیا۔ کچھ عرصہ بعد یعنی ۱۲۰۱ھ میں محمد سعید خاں کا انتقال ہو گیا اور اس کے رسالے کے سب سوار عبدالرحمٰن خاں بہادر کے رسالے میں شامل ہو گئے تو قاسم علی خاں بھی اسی سے منسلک ہو گیا۔

۱۲۰۲ھ میں نواب وزیر الممالک کی طرف سے محمد سعید خاں اور عبدالرحمٰن خاں قندھاری کے رسالے کے کچھ سوار اضلاع فرخ آباد میں نواب مظفر جنگ سے مقررہ خراج کی وصولی کے لئے تعینات کئے گئے۔ اس دستے میں قاسم علی خاں آفریدی بھی شامل تھا۔ چنانچہ وہ بھی اکبر پور اور دولت پور کے علاقے میں تعینات ہوا۔ اس کے سسر زبر دست خاں آفریدی نے قاسم علی خاں کی والدہ اور بیوی کو کولہار سے مع اثاث البیت بلوا لیا اور قاسم علی خاں نے اب مستقلاً فرخ آباد میں سکونت اختیار کر لی۔ یہ سب واقعات چھٹے باب سے لے کر نویں باب تک بیان ہوئے ہیں۔

دسویں باب میں قاسم علی خاں نے نواب آصف الدولہ کی موت کے بعد

نواب وزیر علی خاں کے جانشین ہونے، مسٹر چیری کو قتل کرنے، انگریزی فوج سے مقابلہ کرنے اور عاقبت الامر راجہ جے پور کی غداری کی وجہ سے گرفتار ہو کر کلکتہ بھیج دیئے جانے کے واقعات کو تفصیل سے بیان کیا ہے۔ یہ سارے واقعات اودھ کی تاریخوں میں مرقوم ہیں۔ لیکن قاسم علی خاں نے ان واقعات کو جس طرح سے بیان کیا ہے اس سے اس کے تاثرات اور ہمدردیوں کا اظہار ہوتا ہے۔ وہ نواب وزیر علی خاں کا مداح ہے۔ وہ کہتا ہے کہ نواب وزیر علی خاں امرد ہونے کے باوجود عالی حوصلہ شخص تھا، وہ وزارت ہی پر قناعت نہ کرنا چاہتا تھا بلکہ ممالک "غیر دخلی" پر قبضہ کرنے کا بھی ارادہ رکھتا تھا۔ اس کی یہی بلند ہمتی زوال کا باعث ہوئی۔ کاہل مشیروں اور آرام طلب نوکروں کو یہ خطرہ ہوا کہ اب ان کو عیش و آرام کا موقع نہ ملے گا۔ چنانچہ انہوں نے نواب موصوف کے خلاف سازش کی اور انگریزوں کو بھی ورغلا کر نواب کو عہدہ وزارت سے معزول اور مقید کرنے میں امداد دی۔ الماس خواجہ سرا اور اشرف علی خاں ان سازشیوں کے سرغنہ تھے۔ اس فتنے سے انگریزوں نے فائدہ اٹھایا اور اپنے حلقہ اثر اور دائرہ اقتدار کو وسعت دی۔ چنانچہ انگریزوں کے رویہ پر قاسم علی خاں اپنے مخصوص انداز میں طنز کرتا ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ :-

"چونکہ انگریز بہادر کا ارادہ ہفت اقلیم کے ملکوں بلکہ اس سے بھی زیادہ کو قبضہ میں لانے کا ہے اگر نردبان میسر ہو جائے تو "عالم بالا" کا بھی عزم رکھتے ہیں۔ اسی مقصد کو وہ دل میں لئے رہتے ہیں۔ اور اسی لئے کم فہم مشیروں کی مشاورت کو اپنی دانائی سے قبول کر کے سرکار کمپنی اور بادشاہ انگلستان لندن کے فائدے

کے خیال سے نواب مرحوم کے ساتھ جو پہلے قول و قرار ہوا تھا اسے بھول کر نواب سعادت علی خاں کے ساتھ نیا عہد و پیمان باندھا گیا جس کے مطابق نواب سعادت علی خاں کو مسند وزارت پر بیٹھایا گیا اور انگریزوں کو اس صلے میں صوبجات متعلقہ وزارت کی آمدنی کا نصف اور ممالک متعلقہ فرخ آباد کی ساڑھے چار لاکھ روپیہ کی آمدنی ہمیشہ ہمیشہ کے لئے عطا کر دی گئی"۔ قاسم علی خاں نے اس عہد نامے کی ایک نقل بھی تحریر کی ہے جو اس موقع پر سرکار کمپنی اور نواب سعادت علی خاں کے درمیان ہوا تھا۔ اس عہد نامے میں دس دفعات ہیں۔ پہلے اور دسویں دفعات کی نقل نہیں مل سکی اس لئے اس کا صرف خلاصہ مضمون لکھ دیا گیا ہے۔ باقی دفعات کے بارے میں قاسم علی خاں کا دعویٰ یہ ہے کہ وہ ہو بہو اصل کی نقل ہیں۔ پانچویں دفعہ میں ملک کی ایک کروڑ ۳۵ لاکھ ۲۳ ہزار چار سو بہتر روپیہ آٹھ آنہ آمدنی کی علاقہ واری تفصیل ہے۔

نواب وزیر علی خاں کے ساتھ جن ملازموں نے نمک حرامی اور بے وفائی کی تھی وہ سب نواب سعادت علی خاں کے مقرب بن گئے۔ لیکن قاسم علی خاں کہتا ہے کہ عبد الرحمٰن خاں بہادر قندھاری نے اس موقع پر بڑی دانشمندی کا ثبوت دیا۔ وہ نہ پہلے کسی سازش میں شریک تھا اور نہ اب اس نے نواب سعادت علی خاں کی بے جا خوشامد کی۔ البتہ وہ بدستور سابق ملازمت کرتا رہا۔

گیارہویں باب میں آفریدی نواب سعادت علی خاں کی مسند نشینی اور سرکار اودھ کی ملازمت سے اپنے استعفا کا حال بیان کرتا ہے۔ اسی باب میں نواب امداد حسین خاں بہادر ناصر جنگ خلف دوم نواب مظفر جنگ والی فرخ آباد

اور سرکار کمپنی کے درمیان اس عہد نامے کا بھی ذکر ہے جس کے رو سے ممالک متعلقہ فرخ آباد کمپنی کو ہمیشہ کے لئے تفویض کر دیئے گئے۔ آفریدی نے اس عہد نامے کے بھی جو ۱۸۰۲ء میں ہوا تھا تمام دفعات نقل کئے ہیں۔

فرخ آباد کا نظم و نسق کمپنی کے حوالے کئے جانے پر سرکار وزارت کی طرف سے وہ فوجی رسالہ جو عبدالرحمن خاں بہادر قندھاری کی سرکردگی میں خراج وصول کرنے کے مقصد سے تعینات تھا، لکھنؤ طلب کر لیا گیا۔ یہاں آفریدی کے لئے یہ سوال پیدا ہوا کہ آیا وہ رسالہ کے ساتھ لکھنؤ چلا جائے یا نہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس کا کچھ روپیہ بابت تنخواہ فوج کے ذمے باقی تھا جسے وہ عدالت کی چارہ جوئی کے ذریعے وصول کرنے کا ارادہ رکھتا تھا۔ لیکن اس نے یہ سوچ کر اپنا ارادہ ترک کر دیا کہ کمپنی کی عدالت میں کسی تنازعے کا فیصلہ جلد نہیں ہونے پاتا۔ اس موقع پر وہ کمپنی کے طریقۂ انصاف سے اپنی سخت بیزاری کا اظہار کرتا ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ انصاف کا طریقہ بہت طول طویل ہے اور کمپنی کے قوانین کچھ ایسے ہیں کہ مقدموں کے فیصلے میں برسوں لگ جاتے ہیں۔

انگریزوں کے طریقۂ سیاست اور کمپنی کے قانون عدالت سے بیزار ہو کر آفریدی نے نوابان اودھ کی ملازمت ترک کر دینے کا مصمم ارادہ کر لیا۔ اس کی تنخواہ اتنی کافی نہ تھی جو اس کو کھینچ کر لکھنؤ لے جاتی۔ تھوڑی سی تنخواہ کے لئے فرخ آباد سے ۵ منزلوں کا راستہ طے کرنا اس کو فائدہ بخش معلوم نہ ہوا۔ اس نے بہت سوچ بچار کر کے یہ فیصلہ کیا کہ جب گھر سے بے گھر ہی ہوئے تو جیسا ۵ منزل طے کرنا ویسا ہی ۱۰۰ منزل طے کرنا۔ جب ملازمت ہی پر گذر اوقات ہے تو کیوں نہیں ایسی جگہ

چلنا چاہیے جہاں نہ انگریزوں کا قبضہ ہو اور نہ جہاں ان کا قانون عدالت نافذ ہو۔ اور جہاں اسے تنخواہ بھی زیادہ ملے۔ چنانچہ اس نے جنوب کی طرف کوچ کرنے کا فیصلہ کیا۔

آفریدی تین گھوڑے خرید کر اور سامان سفر درست کر کے چند فرخ آبادی دوستوں کے ساتھ مُورشید آباد آیا اور یہاں سے اپنے بھائی اعظم خاں اور بیٹے رستم خاں کو لے کر ۵ رجمادی الاول ۱۲۱۷ھ کو فیروز آباد کے راستے دکھن کو روانہ ہو گیا۔ کئی دنوں کے سفر کے بعد آگرہ پہنچا۔ یہاں اس نے قلعہ اور تاج محل کی سیر کی۔ تاج محل کی کاریگری سے وہ بہت زیادہ متاثر ہوا اور اس موقع پر اس نے تاج محل کے معماروں اور کاریگروں کی ایک فہرست بھی درج کی ہے۔ اس کے علاوہ بیس قسم کے بیش بہا پتھروں اور نگینوں کی بھی جو اس عجوبہ عمارت میں لگے ہیں تفصیل دی ہے کہ وہ کس کس ملک سے لائے گئے تھے۔ آفریدی نے یہ نہیں لکھا کہ اس نے یہ معلومات کہاں سے حاصل کئے۔

آفریدی آگرہ سے فتح پور پہنچا اور وہاں حضرت سلیم چشتی کے روضۂ اقدس کی زیارت کرتا ہوا آگے بڑھا۔ دریائے چمبل کو عبور کر کے شہر کوٹا آیا۔ یہاں آب ہوا کی خرابی کی وجہ سے وہ بیمار پڑ گیا۔ لیکن یہیں اس کی ملاقات آبھاجی مرہٹہ سے ہوئی اور وہ اسی کی چھوٹی سی فوج میں داخل ہو کر اُجین کی طرف روانہ ہوا۔ کوٹا سے چار منزل اور رکھاٹہ مکندرا سے چھ کوس (کروہ) کے فاصلے پر سِنکلاج گڈھ کا قلعہ تھا جہاں کے قلعہ دار کو مہاراجہ دولت راؤ سندھیا کی فوج نے محصور کر رکھا تھا۔ ابھاجی مرہٹہ نے تو اپنی فوج کے ساتھ اس جنگ میں شریک ہونے کے لئے گھاٹ مکندرا

میں ڈیرہ ڈال دیا اور آفریدی ڈیڑھ سو افغانوں کے ساتھ اوجین کی جانب بڑھا۔ دس روز کے سفر کے بعد وہ دیواس پہنچا جہاں مہاراجہ سندھیا کی فوج مقیم تھی۔ یہاں مان سنگھ نامی ایک رسالہ دار نے ان لوگوں کی پذیرائی کی اور ہر ایک افغانی سوار کے ساتھ خود ملاقات کر کے اسے مہاراجہ موصوف کی ملازمت کے لئے مقرر کیا۔ ایک ماہ کے عرصہ میں ان سواروں کے لئے دو ہزار روپیہ نقد علی الحساب تنخواہ اور اخراجات کے لئے آفریدی کے حوالے کیا جسے آفریدی نے خود اپنے ہاتھوں سے سواروں میں بقدر مراتب تقسیم کر دیا۔

ایک مہینے کے بعد کسی جرم کی سزا میں مان سنگھ رسالہ داری سے معزول کر دیا گیا۔ جس کی وجہ سے افغانوں کی ملازمت بھی معرض خطر میں پڑ گئی۔ آفریدی نے دوسرے پیٹھان سواروں کے ساتھ مہاراجہ کے بخشی اناجی سے ملاقات کی۔ اور اس کو کہہ سن کر اپنی ملازمت برقرار رکھی۔ مشاہرہ فی نفر سوار ایک روپیہ یومیہ مقرر ہوا اس کے علاوہ سالانہ کچھ فاضل رقم بھی دینے کا وعدہ ہوا۔

اس زمانے میں مہاراجہ کے پاس یہ خبر پہنچی کہ مہاراجہ جسونت راؤ ہولکر کی فوج نے پونا میں پنڈت پردھان باجی راؤ پیشوا اور سندھیا کی متحدہ فوج کو شکست دے کر شہر کو لوٹ لیا ہے۔ پیشوا نے گرفتاری کے ڈر سے بھاگ کر تلمبئی (بمبئی) میں جو سمندر میں واقع ہے پناہ لی ہے اور انگریزوں سے مدد طلب کی ہے۔ انگریزوں نے اسے مدد دینے کا اس شرط پر وعدہ کر لیا ہے کہ اپنے متعلقہ ممالک کے کل زر تحصیل میں سے چھ آنہ فی روپیہ سالانہ معاوضہ کے طور پر انگریزی کمپنی کو دیا کرے گا۔ اس خبر کو سن کر مہاراجہ سندھیا نے اندفاع کی غرض سے فوج کو پونا

کی طرف کوچ کرنے کا حکم دے دیا۔ راستے میں موضع سمرول کے پاس پڑاؤ ڈالا گیا۔ یہاں پینے کے پانی کی بڑی کمی تھی۔ ایک تنلی سی ندی کا پانی سپاہیوں کو پینا پڑا۔ جو بڑا بدمزہ اور مضر صحت تھا۔ سپاہیوں کی صحت پر بہت بُرا اثر پڑا۔ بلکہ تقریباً ایک ہزار سپاہی بیمار ہو کر مر گئے۔ اور جو بچ گئے وہ بھی نیم جاں تھے۔ خود آفریدی بھی اسہال میں بُری طرح مبتلا ہو گیا اور دوا دارو کے بعد اچھا ہوا۔ پانی کی قلت اور خرابی کے باعث مہاراجہ سندھیا نے اناجی بخشی کو وہاں سے کوچ کرنے کا حکم دیا۔ چنانچہ وہاں سے ڈیرا اٹھا کر فوج آگے بڑھی اور پانچ کوس آگے ایک دوسرے مقام پر ٹھہری۔ یہاں اسی دن تیسرے پہر مرہٹہ فوج اور فیض اللہ خاں کے ساتھیوں میں کسی بات پر جھگڑا ہو گیا۔ اور بات اس قدر بڑھی کہ خانہ جنگی کی نوبت آ گئی۔ دونوں طرف صفیں آراستہ ہو گئیں۔ اور پتھر اور اینٹ پھینکے جانے لگے۔ اس علاقے میں پتھر بھی بہت تھے اور فریقین نے ان سے خوب فائدہ اٹھایا۔ لیکن فیض اللہ خاں کے آدمیوں کی تعداد کم تھی اس لئے وہ زیادہ دیر تک میدان جنگ میں ٹھہر نہ سکے اور مرہٹوں کی سنگ باری کی تاب نہ لا کر فرار ہو گئے۔ لیکن آفریدی نے بھاگنے والوں کا ساتھ نہ دیا، بلکہ اسی جگہ ڈٹا کھڑا رہا۔ اس کا سبب کچھ تو شباب کا غرور تھا، کچھ قومی غیرت، کچھ جہالت، کچھ اس بات کی توقع کہ لشکر کے دوسرے مسلمان سپاہی اس کی مدد کریں گے اور کچھ یہ گمان تھا کہ شکست خوردہ ساتھی پھر لوٹ کر آ جائیں گے، چنانچہ وہ بہت دیر تک اکیلا پتھر چلاتا رہا۔ آخر مضروب و مجروح اور لہو لہان ہو کر زمین پر گر پڑا۔ مرہٹوں نے افغانوں کا سب ساز و سامان لوٹ لیا اور آفریدی کو مردہ خیال کر کے یوں ہی پڑا چھوڑ دیا۔ رات ہو چکی تھی۔ آفریدی رات بھر نیم جاں زمین پر

پڑا رہا۔ صبح ہوئی تو اناجی نے افغانوں کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر ان سے گذشتہ دن کے واقعہ کے بارے میں معافی مانگی اور ان کا جو سامان مرہٹوں نے لوٹا تھا وہ سب تلاش کرا کر انہیں لوٹا دیا۔ آفریدی کا بھی اسباب واپس ملا لیکن اس کا گھوڑا اس سنگ باری میں ہلاک ہو گیا تھا۔

پھر یہ فوج کوچ کر کے بُرہان پور پہنچی اور اس نے شہر پناہ کے اندر قیام کیا۔

بارہویں باب میں آفریدی نے پہلے شہر برہان پور اور اس کے ساکنوں کے حالات بیان کئے ہیں۔ وہ لکھتا ہے کہ شہر کی عمارتیں پختہ اور دو منزلہ و سہ منزلہ ہیں۔ باغوں میں حوض و فوارے ہیں۔ یہاں انگور اور کیلا بافراط پیدا ہوتا ہے۔ قلعہ کے اندر ایک حمام شہنشاہ اورنگ زیب کا بنوایا ہوا ہے اور اس قدر عمدہ حالت میں ہے، گویا تازہ بنا ہوا ہو۔ شہر کے بازار کشادہ ہیں۔ یہاں ایک مسجد سیاہ پتھر کی بنی ہوئی بہت عالی شان ہے۔ اس میں بیالیس دروازے ہیں اور اس کے مینارے روضہ تاج گنج کے میناروں کی طرح بلند ہیں۔ اس کے ستونوں میں بڑے بڑے پتھر نصب کئے ہوئے ہیں اور ان پتھروں کو اس طرح جوڑا گیا ہے کہ جوڑ کا نشان تک نہیں معلوم ہوتا۔ اس مسجد میں ایک مدرسہ اور ایک مسافر خانہ بھی ہیں۔ اس شہر کے باشندے بوہرا قوم کے ہیں اور اکثر شریف، خوش طبع اور خوش شکل ہیں۔ یہ سب لوگ تاجر پیشہ ہیں۔

برہان پور میں مہاراجہ دولت راؤ سندھیا کے حکم سے اناجی بخشی نے ابھاجی مرہٹہ کو ایک ہزار سواروں کے ساتھ سورت جانے اور وہاں سے بالاجی کنجر کو جو پیشوا کا

مقرب و مصاحب تھا لانے کے کام پر مامور کیا۔ ابھاجی نے چالیس روپیہ نقد برائے خرچ راہ اور واپس آنے پر مزید انعام و اکرام کے وعدے پر افغانی سواروں کو بھی اپنے ساتھ لے لیا۔ چنانچہ آفریدی بھی ایک نیا گھوڑا خرید کر ان کے ہمراہ ہوگیا۔

دس بارہ روز میں یہ لشکر نظیر آباد پہنچا۔ آفریدی کی ملاقات یہاں بادشاہ میاں درویش سے ہوئی۔ آفریدی کا بیان ہے کہ یہ درویش صورتاً رند مشرب تھا، لیکن باطن میں موحد یگانہ اور عارف فرزانہ تھا۔

نظیر آباد سے کوچ کر کے لشکر پھر سورت کی طرف چلا۔ شام کو ایک چھوٹے سے گاؤں کے نزدیک پہنچا۔ تو خبر ملی کہ دو ڈاکو گلزار خاں اور تیغی خاں آس پاس کے پہاڑوں میں سکونت رکھتے ہیں۔ اور قرب و جوار کے علاقے میں لوٹ مار کرتے رہتے ہیں۔ ان کا سرغنہ کالے خاں ایک لودھ ولتیا ہے جو لوگوں کو لوٹ کھسوٹ کر امیر بن گیا ہے اور کچھ علاقے پر اس کی حکومت بھی چلتی ہے۔ ان ڈاکوؤں نے بھیلوں کے ساتھ مل کر لشکر پر شبخون مارنے کا ارادہ کیا ہے۔ اس خبر کو سنتے ہی ابھاجی نے گاؤں سے فوراً کوچ کرنے کا حکم دے دیا۔ راتا راتی سفر کر کے فوج "نیا پورہ" پہنچ گئی، جو سورت سے سات کوس پیچھے ہے۔

نیا پورہ سے لشکر کوچ کر کے سورت پہنچا۔ اور شہر پناہ کے باہر پڑاؤ ڈالا گیا۔ قلعہ انگریزوں کے قبضے میں تھا۔ اس لئے کسی کو اندر جانے کی اجازت نہ تھی۔ آفریدی نے بڑی مشکل سے اجازت حاصل کی اور اندر جا کر شہر کی سیر کی۔ اس نے شہر کے حالات تفصیل سے بیان کئے ہیں۔

سورت سے ابھاجی نے گجرات کی طرف کوچ کیا۔ انکلیسر پہنچ کر خبر ملی کہ بالاجی

کنجر "بسئی" کے قلعے سے نکل کر کشتی کے ذریعے دریائے نربدا کے راستے بھروچ کے قلعے میں پہنچ گیا ہے۔ چنانچہ ابھاجی فوج کو انکلیسر میں چھوڑ کر تھوڑے سے سپاہیوں کے ساتھ جن میں آفریدی بھی شامل تھا دریائے نربدا کو عبور کرکے بھروچ پہنچا۔ اور وہاں بالاجی کنجر سے تنہائی میں باتیں کیں۔ اس موقع پر آفریدی نے قلعہ بھروچ کا تھوڑا سا حال لکھا ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ قلعہ کے متصل کسی بزرگ کا مزار ہے، تربت کے چاروں طرف ایک بالشت چوڑا پانی کا ایک نالا بہتا ہے جس کا پانی آس پاس کے لوگ روزانہ استعمال کرتے رہتے ہیں لیکن پانی نہ گھٹتا ہے نہ بڑھتا ہے' آفریدی اس بات کو اس بزرگ کی کرامات سمجھتا ہے۔

ابھاجی، بھروچ سے لوٹ کر پھر انکلیسر چلا آیا۔ یہاں آفریدی کی ملاقات احمد نامی ایک عرب سردار سے ہوئی۔ اس سردار کے پاس ہاتھی، گھوڑے، چند اونٹ، نقارہ اور عرب پیادوں کا ایک دستہ بھی تھا۔ یہ لوگ تلاش روزگار میں ملک گجرات سے جہاں پہلے یہ گھکواڑ کی فوج میں ملازم تھے اور جاگیروں کے مالک تھے۔ ملازمت اور جاگیر دونوں چھوڑ کر باہر نکل پڑے تھے۔ آفریدی نے احمد سردار سے عربی میں گفتگو کی تو معلوم ہوا کہ یہ بدّو لوگ ہیں اور ملازمت چاہتے ہیں۔

اس اثنا میں بالاجی کنجر بھی قلعہ بھروچ سے نکل کر انکلیسر آ گیا تھا۔ ابھاجی نے اسے ہمراہ لے کر برہان کی طرف کوچ کر دیا۔ ابھی پہلی منزل بھی طے نہ ہوئی تھی کہ افغانی سپاہیوں کے مشاہرے کے بارے میں کچھ تنازعہ پیدا ہو گیا۔ جب معاملہ طے ہونے کی کوئی صورت نظر نہ آئی تو افغانوں نے مہاراجہ سندھیا کی ملازمت سے استعفا دینے کا فیصلہ کر لیا۔ حالانکہ انہوں نے نہ تو اناجی بخشی اور نہ خود مہاراجہ

سندھیا سے اس بات کی اجازت لی تھی۔ چنانچہ ملازمت ترک کر کے مہاراجہ جسونت راؤ ہولکر کی فوج میں نوکری کرنے کے ارادہ سے دکن روانہ ہوگئے۔ احمد عرب اور اس کے ساتھی بھی ان کے ہمراہ تھے۔

تیرھویں باب میں آفریدی، مہاراجہ ہولکر کی فوج میں ملازمت اور افواج ہولکر کی نقل و حرکت بیان کرتا ہے۔ جس وقت آفریدی اور اس کے دوسرے افغان سوار سندھیا کی فوج سے علیٰحدہ ہوئے تھے اس وقت ہولکر کی فوج اورنگ آباد کے قریب خیمہ زن تھی۔ حسن گڈھ پہنچنے پر کالے خاں، تیغی خاں اور گلزار خاں ٹھوکیہ سے ان کی ملاقات ہوگئی۔ ان رہزنوں نے ایک جماعت اکٹھی کر لی تھی جس میں بھیل اور کچھ عرب بھی شامل تھے۔ انہوں نے افغانوں کو بھی اپنی جماعت میں شامل ہونے کو کہا۔ احمد عرب نے ان رہزنوں کی ملازمت قبول کر لی، لیکن افغانوں نے یہ مشورہ نہ مانا اور وہ آگے کوچ کر کے اورنگ آباد کے قریب بیضاپور پہنچے۔ یہاں انہوں نے نجیب خاں رسالہ دار سے ملاقات کی اسی نے ان کی ملاقات مہاراجہ جسونت راؤ ہولکر سے کرائی اور سفارش کر کے فوج میں ملازمت دلوادی۔ مہاراجہ نے آفریدی اور اس کے سات ساتھیوں کو قوم مرہٹہ کے دستور کے مطابق خلعت عطا کیا۔ جن افغانی سپاہیوں کو مہاراجہ کی طرف سے خلعت عطا ہوا وہ یہ تھے — قاسم علی خاں آفریدی خود، بلند خاں متینہ، مراد خاں پسر بہادر خاں بنگش خانزادہ کوہاٹی، نامر خاں برادرزادہ خانزادہ ساکن فرخ آباد، فیض اللہ خاں، محمد شاہ خاں اور غلام حسین خاں قوم متینہ ساکنان قصبۂ رائے پور۔

مہاراجہ ہولکر بیضاپور سے کوچ کر کے چاندوڑ پھر ناسک پہنچا۔ یہاں آفریدی

اس شہر کا حال بیان کرتا ہے۔ اس کے بعد فوج ترمکہ پہنچی۔ اس شہر کو چند دن پہلے مہاراجہ کے سردار اچنبھی سنگھ نے تاخت و تاراج کر دیا تھا۔ یہاں کے باشندے قبل ہی سے پریشان حال و بدحواس تھے، لہٰذا مہاراجہ نے منع کر دیا تھا کہ اسے لوٹا نہ جائے، لیکن اس کے منع کرنے کے باوجود سپاہیوں نے شہریوں کو خوب لوٹا یہاں تک کہ سارے باشندے ڈر کے مارے شہر کو چھوڑ کر بھاگ گئے۔ مہاراجہ نے ترمکہ پر گولہ باری کا حکم دیا، اس قلعے میں راجہ بہادر قلعہ دار کی فوج تھی جس میں کچھ عرب بھی شامل تھے۔ ان عربوں نے جی توڑ کر مقابلہ کیا، لیکن جب خوراک گھٹ گئی تو صلح کی بات کی اور نجیب خاں کے توسط سے انہوں نے قلعہ کا سارا سازو سامان مہاراجہ کے حوالہ کر کے مخلصی حاصل کی۔ اس کے بعد مہاراجہ پہاڑوں کو عبور کرتا ہوا اکوپر پہنچا اور وہاں کے دیہاتوں کو لوٹتا ہوا تاپتی کو عبور کر کے چولی اور مہیسر کا رخ کیا۔

چودھویں باب میں آفریدی سندھیا اور بھونسلے کی فوجوں کی انگریزی فوج کے ہاتھوں شکست اور آفریدی کا ہولکر کی ملازمت سے استعفا دینے کا حال ہے بیان کیا ہے۔

جس زمانے میں ہولکر چولی اور مہیسر کے علاقے میں نقل و حرکت کر رہا تھا۔ اس زمانے میں مہاراجہ سندھیا اور رگھوجی بھونسلے دونوں انگریزوں کے خلاف جنگ کی تیاریاں کر رہے تھے اور ہولکر کو بھی اس مضمون کا متواتر پیام بھیج رہے تھے کہ انگریزی فوج نے پیشوا کو شکست دے کر پیشوا کو ایک ایسے عہد نامے پر دستخط کرنے کے لئے مجبور کر دیا ہے جس کے مطابق پیشوا کو اپنے تمام مقبوضات کی کل آمدنی

کا چھ آنہ فی روپیہ انگریزوں کو ادا کر دینا پڑے گا۔ انگریزی فوج قلعہ نگر کی طرف بڑھ رہی ہے۔ اب مناسب ہے کہ ہم سب قدیمی مخاصمت کو بھلا کر، ایک دوسرے کے متعلق شکوہ شکایت ختم اور آپس میں صلح صفائی کر کے انگریزوں کا مل کر مقابلہ کریں ورنہ سارا ملک انگریزوں کے قبضے میں چلا جائے گا۔ ہولکر نے ان خطوں کے جواب میں لکھا کہ چونکہ میرا بھتیجا کھانڈی راؤ چند سال سے تمہارے قلعہ میں قید ہے اور اس پر زیادتیاں ہوتی ہیں، جب اس کو رہا کر کے میرے پاس بھیج دو گے تو تمہارے قلب کی صفائی اور نیت کا خلوص ثابت ہوگا اور ہم تمہارا ساتھ دے سکیں گے۔
اس خط کے پہنچتے ہی سندھیا نے بھونسلے سے مشورہ کر کے کھانڈی راؤ کو قلعہ کی اسیری سے رہا کر کے اعزاز و احترام کے ساتھ ہولکر کے پاس بھیج دیا۔ لیکن ہولکر نے کھانڈی راؤ کے آتے ہی اپنا وعدہ بھلا دیا۔ وہ اسی طرف بڑھنا رہا جدھر کا اس نے پہلے سے ارادہ کر رکھا تھا۔ البتہ نواب امیر خاں کو یہ حکم دیا کہ تم فوج لے کر سندھیا اور بھونسلے کی مدد کو جاؤ۔ نواب امیر خاں نے ایک لاکھ پچاس ہزار روپیہ مہاراجہ سے لے کر اپنی فوج میں تقسیم کیا اور کوچ کی تیاری کی۔ اسی اثنا میں یہ خبر آئی کہ انگریزوں نے سندھیا اور بھونسلے کی فوجوں کو گھاٹہ اجنتا میں زبردست شکست دے دی ہے۔ اور بھونسلے کے قلعہ گاول گڈھ اور رتنالہ اور سندھیا کے قلعہ اسیر گڈھ پر قبضہ کر لیا ہے۔ بلکہ ان دونوں راجاؤں کا بہت سا علاقہ بھی ان کے ہاتھ آ گیا ہے۔ اگرچہ یہ خبر بہت ناگوار تھی لیکن سچ تھی۔ ہولکر نے نواب امیر خاں کو روانہ ہونے سے منع کر دیا اور نواب کی فوج لوٹ آئی۔
ان ہی دنوں آفریدی اور ہولکر کے بخشی بھوانی شنکر میں تنخواہ کے بارے میں کچھ

تنازعہ ہو گیا۔ بخشی نے مہاراجہ کے پاس جاکر یہ شکایت کی کہ آفریدی نے میرے خیمے میں گھس کر مجھے ناسزا باتیں کہی ہیں بلکہ گالی بھی دی ہے، یہاں تک کہ حضور کی شان میں بھی ناسزا الفاظ استعمال کئے ہیں۔ مہاراجہ نے اس بہتان کی طرف توجہ نہ دی اور خاموش ہو رہا۔ لیکن آفریدی کو یہ احساس ہوا کہ مہاراجہ اس کی طرف سے کبیدہ خاطر ہو گیا ہے اور چونکہ بخشی بھوانی شنکر بہت کینہ پرور شخص تھا آفریدی نے یہی مناسب سمجھا کہ مہاراجہ کی ملازمت کو خیرباد کہہ دے۔ کیونکہ یہ اندیشہ تھا کہ بھوانی شنکر پھر کوئی بہتان باندھے گا اور تنخواہ وغیرہ دینے میں بھی شرارت کرے گا۔ نجیب خاں اور شاہد خاں رسالہ داروں نے ہرچند آفریدی کو ترک ملازمت سے باز رکھنے کی کوشش کی اور اس بات کا وعدہ کیا کہ بخشی سے صلح و صفائی کرا دی جائیگی، لیکن آفریدی نے ان کی باتوں پر اعتماد نہ کیا اور آخر مہاراجہ کی نوکری چھوڑ کر نواب امیر خاں کے لشکر میں شامل ہو گیا۔

پندرہویں اور سولہویں باب میں آفریدی نے امیر خاں کے یہاں ملازمت اور پھر وطن کو واپسی کا حال بیان کیا ہے۔ اس نے امیر خاں کی زندگی کے حالات اور کارناموں پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ امیر خاں جسونت راؤ ہولکر کا حلیف تھا، ہولکر اور امیر خاں میں یہ معاہدہ تھا کہ جو علاقے فتح ہوں گے اور جتنا مال غنیمت ہاتھ آئے گا اس میں دونوں نصفا نصف تقسیم کرلیں گے۔ آفریدی کا بیان ہے کہ اس نے خود امیر خاں سے اس کے حالات زندگی دریافت کئے تھے۔ لہٰذا امیر خاں کے متعلق جو کچھ آفریدی نے لکھا ہے وہ بہت ہی مستند ہے۔ امیر خاں پسر حیات خاں ضلع مرادآباد کے شہر سنبھل کا باشندہ تھا۔ ابتداءِ زندگی میں سنبھل کے کوتوال کا ملازم تھا، اڑھائی روپے تنخواہ

ملتی تھی، لہذا بڑی عسرت میں زندگی بسر ہوتی تھی وہ بہت حوصلہ مند نوجوان تھا۔
قسمت آزمانے کے خیال سے دیس چھوڑ کر پردیس کو نکلا اور دکن کی راہ اختیار کی۔
راستے میں ایک درویش سے ملاقات ہو گئی جس نے امیر خاں سے کچھ مانگا۔ امیر خاں
کے پاس جو کچھ موجود تھا فقیر کے حوالے کر دیا اور کہا میرے پاس بس یہی تھا وہ حوالے
کرتا ہوں، سفر طویل درپیش ہے۔ درویش نے دعا دی کہ ترقی اقبال پاؤگے۔ بہت
تکلیفیں سہہ کر اوجین پہنچا اور اس علاقے میں اس نے چند چھوٹے چھوٹے راجاؤں
کی نوکری کی جن کا پیشہ لوٹ مار تھا۔ یہاں اس نے بہادری کے جوہر دکھائے
جس کے صلے میں اس نے کافی دولت اکٹھی کر لی۔ یہاں تک کہ ایک معقول فوج بھی
جمع کر لی۔ اور بعد میں ہولکر سے جا ملا۔ ہولکر نے اسے نواب امیر الدولہ محمد امیر خاں
بہادر دلاور جنگ کا خطاب عطا کیا۔

یہ اس تفصیل کا اجمال ہے جو آفریدی نے بیان کیا ہے۔

الغرض آفریدی نے امیر خاں کی ملازمت اختیار کر لی۔ درماہہ اور سواروں کی
تنخواہ پانچ سو روپیہ ماہوار طے ہوئی۔ دو سو روپیہ ضیافت کے لئے عطا ہوا۔ لیکن جب
آفریدی نے امیر خاں کے سپاہیوں سے تنخواہ وغیرہ کا حال دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ
تنخواہ وغیرہ محض نام کو ہے۔ البتہ گھوڑوں کے لئے روزمرہ کا دانہ اور سپاہیوں کی خوراک
بیگانوں کو لوٹ کھسوٹ کر مل جاتی ہے۔ ہاں سالوں سال تک مصیبت برداشت
کرنے کے بعد موت کے قریب جب تنخواہ وغیرہ جوڑ کر اتفاقاً مل جاتی ہے تو آدمی گذشتہ
تکلیفوں کو بھول جاتا ہے۔ آفریدی یہ حال سن کر پریشان تو بہت ہوا لیکن اب کوئی
چارہ نہ تھا۔ اس نے ایک قیمتی گھوڑا سواری کے لئے رکھ کر باقی گھوڑوں کو بیچ دیا۔

جو روپیہ پیسہ پہلا جمع تھا اسی کو صرف کرنے لگا۔ گرانی کے سبب یہ اندوختہ بھی جلد ہی ختم ہو گیا۔

اس زمانے میں ہولکر اور امیر خاں چولی او رمہیسر سے نکل کر مخالف سمتوں میں روانہ ہوئے۔ امیر خاں نے مشرق کا رخ کیا اور سرونج اور ساگر وغیرہ کا علاقہ لوٹ کر خزانہ جمع کیا۔ انگریزوں کے ایک دستے سے بھی اس کی مڈبھیڑ ہو گئی۔ اس نے ان کو بری طرح شکست دی اور بہت سے سپاہیوں کو قتل کر دیا۔ آفریدی نے نواب سے چار لاکھ روپیہ بابت اخراجات فوج طلب کیا۔ نواب نے کہا کہ ہولکر کے پاس جاؤ اور وہاں سے مانگ کر لاؤ۔ برسات کا زمانہ تھا اور راستہ بے حد خراب، آفریدی کو مالوہ کی سرزمین طے کرنی تھی جس کے بارے میں وہ خود لکھتا ہے کہ یہاں "پگ پگ نالہ اور ڈھگ ڈھگ نیر ہے"۔ بڑی دشواریوں کے بعد کوٹا کے مقام پر مہاراجہ سے ملاقات کی اور روپیہ کا تقاضا کیا۔ لیکن مہاراجہ اس وقت اپنی فتوحات[1] کے نشہ میں مخمور تھا۔ اس نے التفات تک نہ کی، روپیہ دینا تو الگ رہا۔ آفریدی ایک تو یونہی سفر کی مصیبتوں سے خستہ حال تھا، مقصد میں محرومی نے اس کا دل توڑ دیا۔ امیر خاں کا لشکر یہاں سے ۱۵ منزل کے فاصلے پر تھا اور راستہ بے حد خطرناک۔ مجبور ہو کر اس نے نجیب خاں کے رسالہ میں نوکری کر لی۔

---

[1] مہاراجہ نے انگریزی فوج کو جو کرنل مانسن کی سرداری میں ہنگلاج گڈھ کے قلعے پر قابض تھی، کھاٹ مکندرا میں شکست دی تھی۔ اس جنگ میں آفریدی خانوں نے مخصوصاً زمان خاں آفریدی ساکن گنج پورہ اور نواب احمد خاں بنگش نے بڑی جرأت دکھائی تھی۔ زمان خاں شہید ہو گیا تھا اور بنگش مجروح ہوا تھا۔

اس کے بعد آفریدی نے مہاراجہ ہولکر اور انگریزی کمپنی کی فوجوں کی باہمی جنگوں کا حال بیان کیا ہے۔ ان جنگوں میں چونکہ خود اس نے ایک سپاہی کی حیثیت سے حصہ لیا تھا لہذا اس کے بیانات تاریخی اعتبار سے بہت اہم ہیں۔ ہولکر کی فوج انگریزوں کے تعاقب میں شمال کی طرف بڑھ رہی تھی۔ جب بھرت پور پہنچی تو آفریدی نے ملازمت چھوڑ کر وطن لوٹ جانے کا تہیہ کر لیا۔ اس کے پاس چند اشرفیاں بچ رہی تھیں۔ اس نے ان اشرفیوں کو ایک کپڑے میں سی کر جسے اس نے دکن میں خریدا تھا، نوگیری میں رکھ کر اپنے یابو کی پیٹھ پر باندھ لیا۔ اور فتح پور کی راہ سے فرخ آباد روانہ ہوا۔ راستہ میں بے خبری میں کپڑا پھٹ گیا اور سب اشرفیاں گر گئیں۔ جب وہ گھر پہنچا تو اس واقعہ کا علم ہوا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جس طرح مفلس و قلاش گھر سے نکلا تھا ویسا ہی مفلس و قلاش لوٹ کر آیا۔

رسالہ کے سترہویں اور اٹھارہویں بابوں میں آفریدی نے دکن کی طرف اپنے دوبارہ سفر اور نواب امیر احمد خاں کی ملازمت، امیر احمد خاں اور ہولکر کا انگریزی فوجوں سے مقابلہ، نواب کی انگریزوں کے ہاتھوں سے شکست اور آخر میں پھر وطن کو واپسی کے حالات بیان کئے ہیں۔

فرخ آباد میں کچھ مدت قیام کرنے کے بعد آفریدی نے پھر نواب امیر احمد خاں کے لشکر میں ملازمت کرنے کا ارادہ کیا۔ چنانچہ ۹ر شعبان سنہ ۱۲۱۹ھ (= سنہ ۱۸۰۴ء) کو وہ پھر گھر سے روانہ ہوا۔ اس زمانہ میں نواب کا لشکر مالوہ میں تھا۔ ہولکر کی فوج شمال میں انگریزوں کے ہاتھ شکست پر شکست کھا رہی تھی۔ راہ میں آفریدی کو ان محاربوں کی خبر ملی۔ جھانسی سے آگے بڑھ کر اسے دشوار گذار اور خطرناک راستوں

سے گذرنا پڑا۔ ان راستوں میں چاروں طرف ڈاکوؤں اور لٹیروں نے اپنی کمین گاہیں بنا رکھی تھیں۔ آفریدی بڑی تکلیفیں برداشت کرتا ہوا سانگر اور قلعہ رات گڈھ کی راہ سے نواب کے لشکر میں جا پہنچا جو اس وقت کوراکی اور بھوراسہ میں پڑاؤ ڈالے ہوئے تھا۔ اسے نواب کے یہاں ملازمت مل گئی۔ نواب ہولکر کی طلب پر فوج کے ساتھ بھرت پور روانہ ہوا۔ راستے میں اس نے مالوہ کی پہاڑیوں کو عبور کیا۔ نروراور گوالیار کے قلعوں کے پاس سے گذرا اور لشکر سے بیس بیس کوس کے فاصلے پر دونوں طرف جو جو مقامات آئے ان سے خراج وصول کرتا ہوا چلا۔ بھرت پور پہنچ کر اس نے دیکھا کہ راجہ بھرت پور اور ہولکر دونوں کی فوجیں قلعہ میں محصور ہیں۔ انگریزی فوج نے چاروں طرف سے مورچہ بندی کر رکھی ہے۔ امیر خاں نے قلعہ سے آدھے کوس کے فاصلے پر پڑاؤ ڈالا۔

اس مقام پر آفریدی نے انگریزی فوج کی صف بندی اور اس کے لباس اور تنظیم وغیرہ کی تعریف و توصیف میں کئی سطریں لکھی ہیں۔ اس کے علاوہ بھرت پور کے قلعہ کا بھی حال تحریر کیا ہے۔ قلعہ کے چاروں طرف پانچ پورس گہری خندق تھی جو پانی سے بھری ہوئی تھی۔ قلعہ کی برجیوں پر بڑی بڑی توپیں نصب تھیں۔ قلعہ کے اندر ہولکر کی ہزیمت خوردہ فوج کے علاوہ راجہ کے ۶۰ ہزار مسلح جاٹ سوار و پیادہ موجود تھے۔ شہر پناہ کے اردگرد جنگل اور کانٹے دار درخت تھے۔ انگریزی فوج نے کئی بار قلعے پر حملے کئے لیکن سر نہ کر سکے اُن کے ہزاروں سپاہی ان حملوں میں کام آئے۔ مہینوں کے محاصرے سے عاجز آکر مہاراجہ ہولکر اور رنجیت سنگھ جاٹ مالک قلعہ بھرت پور نے امیر خاں کو سپاہیوں میں تقسیم کرنے کے لئے دو لاکھ روپیہ نقد دے کر اسے انگریزی

طرف بریلی وغیرہ کے علاقے کو تاخت وتاراج کرنے کے لئے بھیجا تاکہ انگریزوں کی
توجہ منتشر ہو جائے۔ اس کے علاوہ یہ بھی مقصد تھا کہ نواب رامپور کو انگریزوں کے
خلاف جنگ میں شرکت کرنے کے لئے آمادہ کیا جائے۔ جو روپیہ امیر خاں کو سپاہیوں
میں تقسیم کرنے کے لئے دیا گیا تھا اس میں سے آفریدی کو بھی سال گذشتہ اور حال کی
تنخواہ وغیرہ کی بابت مبلغ پانچ سو روپئے ملے۔

امیر خاں دس ہزار سپاہیوں کی فوج لے کر بھرت پور سے روانہ ہوا اور دریائے
گنگا وجمنا کو عبور کر کے مراد آباد پہنچا۔ راستے میں انگریزوں کے ماتحت جتنے علاقے
ملے ان سب کو خوب لوٹا۔ مراد آباد میں جیل خانہ سے قیدیوں کو چھڑا کر تشتر (؟)
صاحب انگریز کی کوٹھی پر حملہ کر دیا اور وہاں قتل عام مچا کر سارا اسباب وسامان
لوٹ لیا۔ اتنے میں خبر ملی کہ گورنر جنرل بہادر نے جنرل اسمتھ کو اس علاقے کی حفاظت
کے لئے مامور کیا ہے اور جنرل اسمتھ ۵ ہزار گوروں اور ہندوستانیوں کی ایک
فوج لے کر مراد آباد کی طرف چلا آرہا ہے۔ نواب نے یہ خبر سن کر وہاں ٹھہرنا مناسب
نہ سمجھا اور جلد ہی سے دریائے رام گنگا کو عبور کر کے کاشی پور اور رودر پور کی طرف
رخ کیا۔ راستے میں جہاں جہاں انگریزوں کا قبضہ تھا اسے تاخت وتاراج کیا۔
انگریزی فوج اس کا تعاقب کر رہی تھی۔ نواب امیر خاں نے نواب رامپور کو ملاقات
کے لئے پیغام بھیجا اور شریک جنگ ہونے کی درخواست کی۔ نواب رامپور نے انگریزوں
کی طاقت و اقتدار سے ڈر کر نہ تو شرکت ہی منظور کی اور نہ ملاقات ہی کی۔

یکم ذی الحجہ سنہ ۱۲۱۹ھ کو نواب امیر خاں افضل گڈھ پہنچ گیا تھا۔ یہاں
اس کی فوج کے پنڈاری اور افغانی سپاہیوں کے مابین جھگڑا ہو گیا، نوبت گالی گلوچ

اور مارپیٹ تک پہنچی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جب اس مقام پر انگریزی فوج سے مقابلہ ہوا تو پنڈاریوں نے جنگ میں شرکت نہ کی، دور سے کھڑے تماشا دیکھتے رہے۔ انگریزوں کے پاس توپیں تھیں۔ لیکن امیرخاں کے پاس توپ تو کیا بندوق بھی ندارد۔ صرف نیزہ و شمشیر سے کیا کام چلتا۔ جب حالت خراب ہونے لگی تو دو سو پیدل سپاہیوں نے جو رام پور کے باشندے تھے اور فی الحال امیرخاں کی فوج میں شامل ہو گئے تھے، انگریزی فوج پر حملہ بول دیا۔ انگریزوں کی ہمت بڑھی ہوئی تھی۔ انہوں نے زوردار حملے کئے۔ آخر نقصان عظیم برداشت کر کے امیرخاں کی فوج بھاگ کھڑی ہوئی۔ سب سے پہلے خود امیرخاں اپنا جھنڈا لے کر ایک کشتی میں جو دریائے رام گنگا میں نزدیک ہی بندھی ہوئی تھی، بیٹھ کر فرار ہو گیا اور کسی نہ کسی طرح بھرت پور جا پہنچا۔

آفریدی بھی میدان جنگ سے جان بچا کر نکلا اور بڑی دشواریوں کے ساتھ تیس کوس کا فاصلہ طے کر کے رام پور پہنچا۔ راستہ میں لوگ اس کے گھوڑے کو للچائی ہوئی نظروں سے دیکھتے تھے۔ لیکن کسی نہ کسی طور پر صحیح و سلامت رام پور پہنچ گیا۔ یہاں عبدالغفار خاں ولد فقیر محمد خاں طوغہ کے مکان میں اترا۔ خان مذکور نے حقیقی بھائی کی طرح اس کی خاطر و مدارات کی۔ اور بڑی کشادہ پیشانی کے ساتھ دونوں وقت مرغن غذائیں تیار کر کے کھلائیں۔ آفریدی نے وہاں بیس دن قیام کیا۔ اس اثنا میں اس علاقے میں ہنگامے فرو ہو گئے، اور امن و سکون قائم ہو گیا۔ آخر ۲۴ ذی الحجہ کو وہاں سے رخصت ہو کر بریلی و جلال آباد کے راستے رام گنگا کو عبور کر کے پھر فرخ آباد جا پہنچا۔

انیسویں باب میں آفریدی نے اپنے ذاتی حالات کے متعلق کچھ نہیں لکھا ہے۔ وہ ایک سپاہی آدمی تھا۔ اس نے برسوں مرہٹہ سرداروں کی نوکری کی تھی۔ لہٰذا نوکری سے علیحدہ ہو جانے کے باوجود اس کا خیال ان سرداروں کے کارناموں سے وابستہ تھا۔ چنانچہ اس باب میں وہ ان صلحناموں کا ذکر کرتا ہے جو مہاراجہ ہولکر، سندھیا، بھونسلا اور انگریزوں کے درمیان ہوئے تھے۔

برہان پور کے صوبے میں انگریزوں نے سندھیا اور بھونسلہ کی فوجوں کو شکست دے کر صلح کرنے پر مجبور کر دیا تھا۔ چنانچہ ان کے مابین ایک صلحنامہ ہو گیا جس میں سولہ دفعات تھے۔ ان دفعات کو آفریدی نے رسالہ میں نقل کیا ہے۔ اور اس کا دعوٰی ہے کہ یہ نقل مطابق اصل ہے۔

آفریدی نے راجہ رنجیت سنگھ جاٹ مالک قلعہ بھرت پور اور انگریزوں کے درمیان صلحنامہ ہونے کا واقعہ بھی بیان کیا ہے۔

اس کے بعد مہاراجہ جسونت راؤ ہولکر کے بخشی بھوانی شنکر کھتری کی بیوفائی اور غداری کا حال بیان کیا گیا ہے۔ بخشی مذکور مرتضٰی خاں رسالہ دار کے ساتھ فتح پور میں چھ سات ہزار سپاہیوں کی ایک فوج لے کر انگریزوں کے مقابلے کیلئے متعین کیا گیا تھا۔ یہاں بخشی نے نمک حرامی کر کے انگریزوں سے سازش کی اور لڑائی موقوف کر دی۔ اور مرتضٰی خاں رسالہ دار کے ساتھ انگریزی فوج میں مل گیا اس صلے میں اس نے جنرل لیک سے جاگیر پانے کا وعدہ لے لیا۔ آفریدی کہتا ہے کہ یہ دونوں کمینے تھے لیکن جسونت راؤ ہولکر نے انہیں بڑے عہدے دے رکھے تھے۔ وہ کہتا ہے کہ اگر مہاراجہ کی داہنی آنکھ بندوق کے بیک چل جانے

سے اندھی نہ ہو گئی ہوتی تو وہ ان دونوں نمک حراموں کو پہلے سے پہچان لیتا۔ کمینے اور کم ظرف آدمیوں کے ساتھ احسان کرنے کا یہی بدلہ ملتا ہے۔ یہ دونوں اپنی بیوفائی کی وجہ سے اس قدر بدنام ہوئے کہ اگر کوئی یہ پوچھتا کہ نمک حراموں کا لشکر کہاں ہے تو اس سے لوگ فوراً سمجھ جاتے کہ بھوانی شنکر اور مرتضیٰ خاں کا لشکر مراد ہے۔

۲۴ر دسمبر ۱۸۰۵ء کو انگریزوں اور ہولکر کے درمیان بھی ایک صلحنامہ ہو گیا جس میں ۹ دفعات تھے۔ یہ سارے دفعات رسالہ میں نقل کئے گئے ہیں۔

اس باب کے آخر میں آفریدی نے راجہ جے پور کی اُس شکست کا حال بھی لکھا ہے جو اسے امیر خاں کے ہاتھوں نصیب ہوئی۔ راجہ جے پور نے راجہ میرٹھ سے جنگ کی اور شہر کا محاصرہ کر لیا۔ اس نے اپنی امداد کے لئے امیر خاں کو اس کی فوج کے ساتھ اپنے یہاں ملازم رکھ لیا تھا۔ تیرہ ہزار روپیہ یومیہ تنخواہ مقرر تھی اس کے علاوہ ہر ماہ ایک لاکھ روپیہ مطبخ کے اخراجات کے لئے دینے کا وعدہ تھا، لیکن راجہ اتنی کثیر رقم باقاعدہ طور پر نہ دے سکا اور اسی بنا پر ایک دن دونوں میں تنازعہ ہو گیا۔ امیر خاں خفا ہو کر راجہ کے ملک سے اپنا روپیہ وصول کرنے کے ارادے سے مع فوج نکل کھڑا ہوا۔ راجہ نے بھی شیو لعل بخشی کی سرکردگی میں چھ ہزار سوار اور چھ پلٹن تعاقب میں روانہ کیا۔ اگرچہ امیر خاں نمک خواری کے باعث شیو لعل بخشی کی فوج کا مقابلہ کرنے سے برابر احتراز کرتا رہا اور راجہ کو یہ کہلا بھیجا کہ تم میرا زر بقایا وصول کرا دو ورنہ تمہارے ملک کو لوٹ کر وصول کر لوں گا۔ لیکن راجہ نے نہ مانا اور امیر خاں کو مروا ڈالنے کی فکر میں رہا۔

آخر امیر خاں نے راجہ کی فوج کو زیر و زبر کر کے بہت سا سامان جنگ و آلات حرب چھین لیا۔ راجہ شیو لعل بخشی کی شکست سن کر بہت متفکر ہوا اور میرٹھ کا محاصرہ اٹھا کر جے پور چلا آیا۔

آفریدی نے اس کی شکست پر خوشی کا اظہار کیا ہے کیونکہ اس کے خیال میں یہ درحقیقت اس بے وفائی اور غداری کا خدائی بدلہ تھا جو اس نے وزیر علی خاں مظلوم کے ساتھ کی تھی۔

بیسویں باب میں آفریدی نے میر جعفر مبیح کے یہاں اپنی ملازمت کا حال بیان کیا ہے۔ فرخ آباد پہنچنے کے بعد آفریدی نے اب مستقل سکونت اختیار کر لی تھی۔ اس نے سوچا کہ تین برس تک مہاراجہ سندھیا، مہاراجہ ہولکر اور امیر خاں ایسے بڑے سرداروں کی ملازمت کی اور سخت مصیبتیں جھیل کر ان کی خدمت کی۔ یہ سب اس نے اس خیال سے کیا تھا کہ معقول دولت جمع کر کے باقی ماندہ عمر اطمینان سے وطن میں بسر کرے گا۔ لیکن قسمت نے ساتھ نہ دیا۔ مقدر میں جو مفلسی لکھی تھی وہ علی حالہ قائم رہی۔ اگر خداوند تعالیٰ کو اس کی فلاح و بہبود منظور ہو گی تو وطن ہی میں غیب سے اس کے لئے کوئی سامان کر دے گا۔ چنانچہ اس نے طے کر لیا کہ اب وطن سے باہر نہ جاؤں گا۔ گھر میں جو کچھ ساز و سامان اور پاس میں جو کچھ روپیہ تھا اس کے سہارے کسی کے آگے دست احتیاج پھیلائے بغیر کچھ دن تک کام چلاتا رہا۔ لیکن اس عرصے میں انگریزی عدالت کے عملوں سے آشنائی پیدا کی۔ اور اس محکمے میں کوئی آسامی حاصل کرنے کی فکر میں رہا۔ بہاؤ الدین خاں ناظر سے اس کی اچھی ملاقات تھی۔ ان ہی سے برابر دریافت کرتا رہتا تھا۔ لیکن دو برس

تک کوئی صورت ملازمت کی نہ نکلی۔ اسی اثنا میں مسٹر کاک برن کلکٹر فرخ آباد نے بریلی سے میر جعفر مسیح کو فرخ آباد بلوا کر ان کو پرگنہ شمس آباد کی تحصیل داری تفویض کرنی چاہی۔ میر جعفر مسیح نے اس عہدہ کو اپنے لئے ناموزوں سمجھ کر اپنے بیٹے میر عابد مسیح کو مقرر کرا دیا۔ آفریدی نے میر جعفر مسیح سے ملاقات پیدا کی۔ میر صاحب لکھنؤ کے باشندہ تھے اور بڑے قابل و دانشمند اور خوش طبع شخص تھے۔ انہوں نے اپنے بیٹے کے ماتحت آفریدی کو عدالت میں ایک معمولی سی عارضی آسامی دلوا دی۔ اور یہ وعدہ کیا کہ جب میر عابد مسیح کا عہدہ بورڈ آف ریونیو صدر کلکتہ کی منظوری سے مستقل ہو جائے گا تو آفریدی کا درجہ اور مشاہرہ بھی بڑھا دیا جائے گا۔ لیکن چار مہینے کے بعد بورڈ نے سابق تحصیلدار کو بحال کر دیا اور میر عابد مسیح کی مدت ملازمت ختم ہو گئی۔ ان کے ساتھ ساتھ آفریدی کو بھی اپنی ملازمت سے علیحدہ ہونا پڑا۔ اور وہ پھر بے روزگار ہو گیا۔

ان حالات کو بیان کرنے کے بعد آفریدی عدالت کے مختلف عملوں اور کارروائیوں کے متعلق الفاظ و مصطلحات کی ایک فہرست دیتا ہے۔ تاکہ فارسی داں لوگوں کو وقت پر کام آئے۔ اس کے بعد عدالت میں کس طرح کارروائی ہوتی ہے اس امر پر بھی تھوڑی روشنی ڈالی ہے۔

اکیسویں باب میں آفریدی نے اپنے خاندان کے بعض اشخاص کے نام لکھے اور ان کے حالات بیان کئے ہیں۔ اور آخر میں رسالہ آفریدی کی تالیف کی ضرورت اور وجہ تحریر کی ہے۔ درحقیقت یہ رسالہ کا آخری باب تھا۔ لیکن تین برس کے بعد بائیسویں باب کا اضافہ کیا گیا جس میں آفریدی نے محکمۂ عدالت میں اپنی

معاصر
ملازمت اور اپنے تیسرے بھائی اعظم خاں کی بیماری اور موت کا حال بیان
کیا ہے ۔
بہاؤ الدین خاں نجیب ناظر و سررشتہ دار عدالت و فوجداری نے مسٹر جیمس
پاٹن قائم مقام مجسٹریٹ ضلع فرخ آباد سے سفارش کر کے آفریدی کو ملازمت
دلوا دی چنانچہ وہ ۳۱ - دسمبر ۱۸۰۷ء کو فوجداری جیل کے داروغہ کی حیثیت
سے ملازم ہوا - اس کے بعد جب مسٹر جان ملبر صاحب مستقل مجسٹریٹ ہو آئے تو
انہوں نے آفریدی کو فوجداری محبوس خانہ کے علاوہ محبوس خانہ عدالت کا داروغہ
بھی بنا دیا - یہ واقعہ یکم جون ۱۸۰۸ء کا ہے - اس وقت سے اس باب کے لکھنے
تک آفریدی اس عہدے پر قائم تھا - مسٹر جان ملبر کا ترقی کے ساتھ پٹنہ کو تبادلہ
کر دیا گیا ۔

اس باب کی تاریخ تصنیف تک آفریدی کی تحریر کے مطابق قبیلہ سلطان
خیل کے ۵۰ افراد ہندوستان میں موجود تھے ۔

آخر میں آفریدی نے یہ ارادہ ظاہر کیا ہے کہ اگر زندگی نے وفا کی تو ولایت
(یعنی صوبہ سرحد) کی سیر کو جاؤں گا اور وہاں سے آ کر اس ملک کے حالات کے متعلق
ایک اور باب لکھ کر اس رسالہ میں اضافہ کر دوں گا ۔

اس کے بعد تصوف و عرفان کی حقیقت و ماہیت کے متعلق ایک طویل سا
مقالہ ہے جس میں صوفیانہ عقائد اور اس کے مختلف مسائل سے بحث کی گئی ہے ۔

چودہ سال گذر جانے کے بعد آفریدی نے اپنے رسالہ میں تیئیسویں باب کا
اضافہ کیا - اس میں اس نے اپنے ان اعزا و اقربا کا حال بیان کیا ہے جن کے بارے

یں آفریدی کو اس اثنا میں حالات معلوم ہو گئے تھے۔

اس باب کے آخر میں اس بات پر افسوس ظاہر کیا ہے کہ ولایت افاغنہ میں طوائف الملوکی ہو گئی ہے۔ اور جو علاقے مدت سے بادشاہ افاغنہ کے قبضے میں تھے اب سکھوں کے ماتحت ہیں اور بعض افغانوں نے سکھوں کے ظلم و ستم سے پریشان حال ہو کر ہندوستان کے مقام لودھیانہ میں سکونت اختیار کر لی ہے اور انگریزوں نے اپنے خزانے سے ان کے لئے حسب مراتب ماہوار وظیفہ مقرر کر دیا ہے۔ افغانستان کا بادشاہ ہرات میں مقیم ہے اور خراساں کے سرداروں سے مصروف جنگ ہے۔ اسے اتنی فرصت نہیں ہے کہ اپنے ملک موروثی کی طرف توجہ کرے۔

آفریدی کے اس بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ اپنے آبائی وطن جانے کا جو ارادہ اس نے بائیسویں باب میں ظاہر کیا تھا وہ ملک کے سیاسی حالات کے سبب شرمندۂ تعمیل نہ ہو سکا۔ ورنہ وعدہ کے مطابق وہ ضرور وہاں کے حالات لکھ کر اس رسالہ میں شامل کرتا۔ اس سے یہ بات بخوبی ثابت ہو جاتی ہے کہ قاسم علی خاں کی ساری زندگی پیدائش سے لے کر موت تک ہندوستان میں گذری اور اس کو صوبہ سرحد میں جانے کا کبھی موقع نصیب نہ ہوا۔ لہٰذا جناب فارغ بخاری اور ضیا جعفری صاحب کا یہ دعویٰ کہ قاسم علی خاں صوبہ سرحد کا پہلا اردو شاعر ہے غلط ثابت ہو جاتا ہے۔

رسالہ آفریدی کے اختتام پر خدا بخش مرحوم بانی کتب خانہ مشرقیہ پٹنہ کی تحریر میں آفریدی کی تاریخ وفات ۱۵۔ جمادی الاول ۱۲۴۱ھ درج ہے۔ اس طرح تئیسویں باب کی تصنیف کے دو سال کے بعد ہی مصنف کا انتقال ہو گیا تھا۔

رسالہ آفریدی کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ قاسم علی خاں ایک سچا سپاہی تھا۔ اسکی طبیعت حوصلہ مند اور بیباک واقع ہوئی تھی۔ اس کا مقصد روپیہ کمانا تھا جس میں وہ بُری طرح ناکام رہا۔ لیکن اس نے روپیہ کی خاطر کسی سے غداری یا بیوفائی نہیں کی بلکہ نمک حرامی کو وہ سب سے بڑا جرم سمجھتا تھا۔ بھاڑے کا سپاہی ہونے کے باوجود اسے انگریزوں سے نفرت رہی۔ ملک میں ان کی بڑھتی ہوئی طاقت کو دیکھ دیکھ کر اس کا دل بیحد کڑھتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اس نے شمالی ہندوستان کو چھوڑ کر دکن کے دشوار گذار علاقوں میں مرہٹہ سرداروں کی نوکری کی۔ یہ البتہ قسمت کا چکر ہے کہ جن انگریزوں سے اسے نفرت تھی آخر زندگی میں روزی کمانے کے لئے اسے ان ہی انگریزوں کے یہاں نوکری کرنی پڑی۔

آفریدی کو مزاجاً سپاہی ہونے کی وجہ سے جنگوں کو بیان کرنے میں لطف آتا ہے۔ یہی سبب ہے کہ رسالہ کا اکثر و بیشتر حصہ جنگوں ہی کے حالات سے معمور ہے۔ اس کے تمام بیانات اس لحاظ سے بہت ہی مستند اور کارآمد ہیں کہ اس نے ان تمام واقعات کو خود اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ اور اکثر معرکوں میں خود شریک ہوا تھا۔ اُس زمانے کی تاریخ لکھنے میں اس رسالے سے بھی کافی مدد ملتی ہے۔

آفریدی بہت زیادہ پڑھا لکھا آدمی نہ تھا۔ اور نہ وہ شعر و سخن کا مرد میدان تھا۔ اس لئے نہ صرف اس کی شاعری بہت ہی معمولی قسم کی ہے بلکہ رسالہ آفریدی کی عبارت بھی سرتاسر خامیوں سے معمور ہے۔ اس نے شاعری محض اپنے عشق کے جذبات کی ترجمانی کی خاطر کی تھی۔ اگر اُسے شعر و سخن سے دلچسپی ہوتی تو وہ رسالہ آفریدی کو جنگوں کے حالات کے بجائے شاعروں کے تذکرے اور حالات سے بھر دیتا۔ آفریدی کی شاعرانہ خصوصیات پر تبصرہ ایک الگ مضمون کا محتاج ہے۔

غالب کے متعلق ایک قدیم مضمون

از خواجہ احمد فاروقی

مرزا غالب کا ذکر قدیم اخبارات و رسائل میں اکثر جگہ ملتا ہے۔ دہلی اردو اخبار میں ان کی بعض طرحی غزلیں ہیں اور ان کے ابتلائے اسیری کا دوسرا واقعہ مندرج ہے۔ احسن الاخبار میں اُن کی پہلی گرفتاری کی روداد ہے۔ اخبار الاخیار مظفر پور ضلع ترہت جو سینٹفک سوسائٹی بہار کی طرف سے ۱۸۶۸ء میں شائع ہونا شروع ہوا، اس میں غالب کے انتقال کی خبر ہے۔ اُن کے متعلق پہلا تفصیلی مضمون غالباً وہ ہے جو "ذخیرۂ بال گوبند" (مارچ ۱۸۶۹ء) میں شائع ہوا۔ اور جسے پروفیسر مسعود حسن رضوی صاحب نے "احوال غالب" میں نقل کیا ہے۔

ذیل کا مضمون "مرزا اسد اللہ خاں غالب" رسالہ مرقع عالم ہردوی (جلد ۷ نمبر ۱۰ و ۱۱ اکتوبر و نومبر ۱۸۹۶ء) میں نواب سید احمد شفیع صاحب بہادر رئیس فرید آباد ضلع دہلی مصنف "تہذیب" کی طرف سے شائع ہوا ہے۔ مرقع عالم کی اسی جلد میں نواب صاحب کا ایک خط بھی قارئین رسالہ کے نام ہے جس میں ایک گشتی لائبریری کے قیام کی تجویز ہے تاکہ علمی اور تاریخی کام میں سہولت ہو۔

مضمون زیر بحث غالب کے انتقال کے سترہ برس بعد ایک ایسے شخص کی جانب سے شائع ہوا ہے جو غالب سے رشتہ داری کا دعویدار ہے اور

جس نے ان کے بزرگوں اور دوستوں سے معلومات بہم پہنچائی تھیں۔

اِس مضمون میں بلّی کے مرنے اور کوچہ چیلاں کے ایک نازک مزاج دوست کا جو لطیفہ درج ہے، وہ اور کسی جگہ میری نظر سے نہیں گزرا۔ تقریباً اسی زمانے میں (۱۸۹۶ء) حالی نے یادگار غالب مرتب کی ہے اس میں بھی یہ واقعہ موجود نہیں ہے۔ شہابی اکبرآبادی اور نظامی بدایونی نے کل معتبر اور غیر معتبر لطیفے جمع کر دیے ہیں لیکن اس لطیفے کی طرف اشارہ بھی نہیں کیا۔

دہلی کالج کی نوکری سے انکار کا واقعہ آزاد نے آب حیات میں لکھا ہے اور حالی نے یادگار میں آزاد ہی کے حوالے سے نقل کیا ہے۔

اس مضمون میں ان "ستمہائے عزیزاں" کا بھی ذکر ہے جن سے تنگ آ کر غالب کلکتہ کے سفر پر مجبور ہوئے۔

جناب مہر نے غالب کے اس قصیدے (چہرہ اندودہ بگردِ رہِ آشفتہ نجوں:
خود گواہم کہ زدہلی بچہ عنواں رفتم) کی تاریخ نومبر ۱۸۲۶ء کے بعد کی قرار دی ہے (غالب ص ۲۱۵ اشاعت ثانی) نواب احمد شفیع کا خیال ہے کہ یہ قصیدہ لکھنؤ پہنچ کر لکھا گیا اور ربیطے ہے کہ وہ ۱۸۲۷ء میں وہاں تھے۔ اس طرح مولانا ابوالکلام آزاد کا یہ استدلال صحیح ہے کہ "اس قصیدے کی تشبیب سے معلوم ہوتا ہے کہ کم از کم تشبیب کا بڑا حصہ سفر کلکتہ میں ضرور لکھا گیا کیونکہ صریح ان حالات پر مشتمل ہے جو سفر کا باعث ہوئے تھے یعنی اقارب کا جور و ستم، اہل وطن کی بے اعتنائی..."

غالب نے ایک اور قطعے میں سفر کلکتہ کی غرض و غایت "ساقی بزم آگہی" کی زبان سے ادا کی ہے:

گفتمش چیست منشار سفرم گفت "جور و جفائے اہل وطن"

قلمی نسخہ دیوان غالب مملوکہ پروفیسر محمود شیرانی مرحوم کے حاشیے پر وہ غزلیں درج ہیں جو بقول اکرام "بظاہر سفر کلکتہ کی یادگار ہیں اور جن میں بے مہری یاران وطن کا ذکر ہے :-

تھی وطن میں شان کیا غالب کہ ہو غربت میں قدر
بے تکلف ہوں وہ مشت خس کہ گلخن میں نہیں
کرتے کس منہ سے ہو غربت کی شکایت غالب
تم کو بے مہریٔ یاران وطن یاد نہیں

ذیل میں اس مضمون کا پورا متن درج کیا جاتا ہے :-

مرزا اسد اللہ خاں غالب

گر دہم شرح ستمہائے عزیزاں غالب رسم امید ہما نا ز جہاں برخیزد

چونکہ ہم نے اپنے مضمون کو ایک شعر سے شروع کیا ہے اس سبب سے ہمیں خیال ہے کہ مرقع عالم کے ناظرین کہیں خیالی مضمون نہ سمجھ لیں اور کہنے لگیں کہ لیجیے خیالی دنیا کی سیر ہونے لگی یا حسن وعشق کے منظروں میں جا پھنسے، ہم اپنے دوستوں کو اطمینان دلاتے ہیں کہ ایسا ہرگز نہیں ہے اور خود شعر بھی تو بتا رہا ہے کہ وہ کن واقعات پر مملو ہے۔ اگرچہ ہمیں یہ دعوٰی تو نہیں ہے کہ ہم کوئی تاریخی مضمون پیش کرتے ہیں مگر ہاں یہ ضرور کہیں گے کہ اس شعر کے ضمن میں ہمارے احباب کو شاعر کے واقعات اور مختصر حالات سے ضرور آگہی ہو جائے گی اور پھر مؤثر الفاظ میں

یہ بھی بتایا جائے گا کہ یہ شعر کہاں اور کس موقع پر لکھا گیا تھا اور اس کے جذبات کس قدر سچے ہیں یہ مرزا اسد اللہ خاں غالب کا مقطع ہے مرزا غالب کا نام آج بزم سخن میں جس اعزاز کا مستحق ہے اس کے بیان کرنے کی ہمیں ضرورت نہیں ہے :

افسوس زمانہ بڑا ہی ناقدرداں ہے اس نیلی چھت کے سائے میں اہل کمال کو ہمیشہ مصیبت ہی کا سامنا رہا۔ شعرائے مغرب کا حال ایبور گولڈ اسمتھ نے بہت تفصیل کے ساتھ موثر الفاظ میں لکھا ہے اس وقت ہمیں اس کی تو ضرورت نہیں ہے کہ ہم ان شعرا کا حال ایبور کی زبانی تفصیل کے ساتھ لکھیں لیکن یہ ضرور بتا دینا چاہئے کہ باوجود اس کمال کے جو انہیں حاصل تھا سب فاقے کرتے کرتے اور چکیاں پیستے پیستے مر گئے۔

انگلستان کے شاعر ڈرائیڈن، اسپنر، اطالیہ کے ٹیسو، پالو بورگیسی، فرانس کا کسنڈری اور یونان کے ہومر، ٹرنس، پلاٹس ان سب کا حال دیکھنے سے معلوم ہوسکتا ہے کہ بے چاروں پر کیا کیا مصیبتیں بیت گئیں اور زمانہ کے ہاتھوں انہیں کن کن ذلتوں سے سابقہ پڑا۔

ایران کے جادو نگار شعرا کچھ ان سے بری حالت میں نظر آئیں گے -
فردوسی، عضائری، انوری، حافظ شیرازی، بغور دیکھئے تو سب ایک ہی رنگ میں ڈوبے ہوئے ہیں اوروں نے تو پردہ پردہ میں کہا ہے حافظ نے تو صاف الفاظ میں کہہ دیا۔ ع "اسپ تازی شدہ مجروح بزیر پالاں"

اب ذرا اپنے اردو کے شعرا کا حال سرسری نظر سے دیکھ جائیے۔ میر جن کو خدائے سخن کا سچا خطاب دیا گیا ہے، کیا تھے اور ان کی عمر کس طرح گزری، دلی

سے لکھنؤ جاتے وقت جس قدر دماغ جوہر سخن سے بھرا ہوا تھا اس سے زیادہ ان کی آستینیں افلاس اور تہی دستی سے بھری ہوئی تھی۔ غریب کو پورا کرایہ بھی نہ جُڑا آخر ساجھے پر گاڑی کرایہ کی انشاء اللہ خاں، سودا اور سب سے زیادہ ذوق کو لیجیے جن کو بادشاہ کے استاد بننے کا بھی فخر حاصل تھا جناب ذوق کی حالت ہم سے پوچھیے کہ کس طرح گزری اور وہ کس قدر اپنی ضروریات سے فارغ اور مستغنی تھے اگرچہ ہمیں ابراہیم ذوق کے دیکھنے کی نوبت نہیں آئی لیکن معتبر ذرائع سے جس قدر ہمیں معلوم ہوا وہ اسی قدر ہے کہ ان کی عمر نہایت تنگدستی کی حالت میں گزری ان سب سے قطع نظر کر کے ہمیں مرزا غالب کی طرف متوجہ ہونا چاہیے۔ میرزا غالب کے حالات لکھنے کا ہمیں بوجہ ایک دور کے رشتے کے سب سے زیادہ حق حاصل ہے ہمیں مرزا صاحب کی زیارت کا شرف تو حاصل نہیں ہوا جس کا افسوس ہے، لیکن اپنے بزرگان کی زبانی ایسے سچے واقعات ہمیں معلوم ہوئے ہیں جن کا مختصر بیان بھی لطف سے خالی نہ ہوگا۔

جس مسند[1] پر امیر خسرو عرصہ تک بیٹھ کر زمانے کو اپنی نغمہ سنجیوں سے والہ و دیوانہ بنائے رہے تھے اور پھر دنیا کو چھوڑتے وقت آئندہ کسی کو اس کے لائق نہ سمجھ کر صندوق میں بند کر کے چھوڑ گئے تھے۔ اپنے دور میں مرزا صاحب نے اسی صندوق کا قفل کھولا اور خندہ جبینی کے ساتھ اسی مسند پر (ص ۷۵) اپنا مبارک قدم رکھا اور سچ پوچھیے تو وجد میں آ کر اور جھوم جھوم کر کچھ ایسی دل میں پیوست ہونے والی آواز اور مؤثر لہجے میں نغمہ سرائی کی کہ اہل دل کے

---

[1] ہمارا مطلب شعر و سخن کی مسند سے ہے حضرات صوفیہ کچھ اور نہ سمجھ لیں (احمد شفیع)

دلوں ہی میں جا کر ٹھہری اور چاروں طرف سے آواز تحسین آنے لگی۔ قصائد میں اپنے زمانے کے مستند شاعر عرفی کے قصائد پر مرزا غالب نے غائر نظر ڈالی اور خود بھی اسی طرف جھک پڑے یہ تو ہم نہیں کہہ سکتے کہ عرفی سے ان کا پلّہ بھاری رہا۔ مگر یہ کہہ دینا بھی سراسر ناانصافی ہے کہ قصائد کی دنیا میں وہ عرفی سے بہت پیچھے ہیں۔

مرزا صاحب بہت ہی سیدھے سادے بزرگ تھے مذاق اور ہر دل عزیزی ان کے مزاج میں تھی جناب نواب صاحب والی ریاست لوہارو اس وقت بہت کم عمر تھے کبھی کبھی مرزا صاحب کی خدمت میں جاتے رہتے تھے اور مرزا صاحب بھی ان سے بہت محبت کرتے تھے اکثر فرمایا کرتے " سنو میاں! نواب امین الدین خاں تمہارے دادا ہیں اور میں تو دلدادہ ہوں"۔ مرزا صاحب کا مکان دہلی میں بلّی ماروں کے محلّہ میں تھا ایک شہر کے امیرزادے جو کوچہ چیلاں[۲] میں رہتے تھے مرزا صاحب کو بہت محبت تھی، یہ صاحب اعتدال سے زیادہ نازک مزاج اور ضعیف الاعضا تھے شام کے وقت گھر سے باہر نکلتے تھے کبھی یار وزانہ مرزا صاحب کی خدمت میں بھی حاضر ہوتے تھے۔ مرزا ان سے کہا کرتے "کیوں صاحب! ہماری آنکھیں تمہارے دیکھنے کو ترستی ہیں اور تم ایک وقت کے سوا فقیر غالب علی شاہ کے تکیے پہ تشریف نہیں لاتے گرمی کے موسم میں تمازت اور حدّت آفتاب کی مانع ہے سردی میں زکام اور نزلے کا اندیشہ نہیں آنے دیتا، برسات میں تو بجلی کے مارے آپ گھر سے باہر قدم بھی رکھتے ڈرتے ہو، گر پڑے گی تو کیوں کر؟ آپ کی نزاکت ہمارے لیے وبال جان ہو گئی۔ تم مجھے بھی جانتے ہو میں گرمہ گشاں[۳] میں رہتا ہوں" وہ صاحب

---

۲ [illegible] ں بلّی ماروں سے ایک میل کے فاصلہ پہ ایک محلہ ہے ۱۲

سُن کے چُپ ہو گئے (ص ۷۶)۔ کیونکہ فی الواقع وہ اپنے مزاج سے مجبور تھے۔
مرزا صاحب کے ہاں ایک بلّی پلی ہوئی تھی اس سے آپ کو بہت محبت تھی بلکہ فارسی کے دیوان میں ایک قطعہ بھی لکھا ہے۔ ایک دن گربۂ موت نے اس بلّی کے ٹینٹوا آدابا، جاڑوں کا موسم تھا رات کے گیارہ بجے تھے مینہ برس رہا تھا اندھیری چھائی ہوئی تھی۔ سردی کے سبب سے دانت بجتے تھے آپ نے مکان کا چراغ گل کر دیا۔ پلنگ پر مردہ بلّی کو لے کر لیٹ گئے اور خدمت گار کو آواز دی وہ حاضر ہوا تو بھرّائی ہوئی اور سہمی ہوئی آواز سے کہنے لگے "ارے بکبخت کچھ تجھے میری بھی خبر ہے؟" وہ نمک حلال ملازم آج کل کے نمک خواروں کی طرح نمک حرام نہ تھا۔ گھبرا گیا اور پوچھنے لگا "حضور کیا ہے؟" آپ نے کہا "کوئی دم کا مہمان ہوں۔ لالٹین لے جا کوچۂ چیلاں میں فلاں صاحب کو بلا لا۔ کہہ دیجیو کہ اگر مرزا غالب کو دیکھنا ہے تو میرے ساتھ چلے چلو۔" یہ کہہ کر کراہ سے ایسی سانس لی کہ نوکر ڈر گیا۔ لالٹین لے کمبل سنبھال ہانپتا کانپتا ان صاحب کے مکان پر پہنچا۔ کنڈی کھٹکھٹائی۔ دروازہ دھمدھمایا اور بے تحاشا چیخنے لگا کنڈی کھولو۔ گھر والے ڈر گئے الٰہی کیا آفت آئی، ماما نے ڈیوڑھی پر آ کر پوچھا "کون ہے کہاں سے آیا ہے خیریت تو ہے؟" نوکر نے کہا "میاں کو ذرا بھیج دو۔ میرزا غالب کا نوکر ہوں۔ باقی حال ان سے کہوں گا۔"

۳۔ یہ ایک مزیدار لطیفہ ہے کہ ایک طہرانی نے اپنے وطن جاتے وقت میرزا سے کہا اپنا پتا لکھ دیجیے۔ انھوں نے ہندوستان۔ شہر دہلی۔ محلہ بلّی ماران لکھ دیا اُن بزرگ نے وطن پہنچ کر لفافے پر لکھا ہندوستان۔ شہر دہلی، محلہ گربہ کشاں۔ پوسٹ مین حیران تھا کہ یہ کون سا محلہ ہے مگر مرزا غالب ایک مشہور آدمی تھے اس سبب سے خط مل گیا۔ نیرّ

ماما نے میاں سے کہا وہ غریب بدحواس دوڑتے ہوئے دروازے پر آئے اور کہنے
لگے ارے خیر تو ہے مرزا غالب پر کیا گزری؟ نوکر رونے لگا اور کہا آپ ہی چل کر
دیکھ لیجیے کوئی دم اور ساعت کے مہمان ہیں وہ بامہر اور اہل وفا لوگ تھے یہ سن کر
بے تاب ہو گئے ایک دُہتر اپنے سر پر ماری اور ہائے غالب کہہ کر رونے لگے۔
مزاج کے ہاتھوں مجبور تھے مگر یہ ایسی کشش نہ تھی جو بیٹھ رہتے، دو چار گرم کپڑے
اوپر تلے پہنے، پاجامہ گھٹنا بنایا، چھتری لگا، ننگے پاؤں، بھیگتے، ٹھوکریں کھاتے نوکر
کے ساتھ ہوئے۔ پاؤں زخمی ہو گئے، ناخونوں سے خون جاری ہو گیا، بدحواس
(ص ۷۷) اور پریشاں مرزا صاحب کے مکان پر پہنچے۔ پلنگ کے قریب جا کر
آواز دی "غالب! غالب" جواب ندارد "مرزا غالب ہائے ہائے للہ کچھ تو بولو"
ایک لڑکھڑاتی اور مدھم آواز میں جواب ملا "کیا ہے؟" وہ صاحب کہنے لگے
"آخر بتاؤ تو کیا ہوا؟" آواز آئی "روشنی قریب لاؤ، لحاف اٹھا کر دیکھو" لالٹین
قریب آئی لحاف اٹھایا تو دیکھا کہ آپ چت پڑے ہیں بلی مری ہوئی پڑی ہے۔
وہ صاحب نہ سمجھے پھر پوچھا کیا حال ہے۔ کہا "دیکھو نا یہ بلی مر گئی ہائے غالب کو
سخت صدمہ ہوا" یہ کہا اور اُٹھ بیٹھے۔

مرزا غالب ایبکی ترک تھے۔ بڑے خاندانی اور شریف بزرگ تھے۔ چنانچہ ایک
قطعہ میں آپ لکھتے ہیں ؎

ایبکم از جماعۂ اتراک   در تمامی ز ماہ دہ چندیم

بعض حضرات حیرت سے ذکر فرمایا کرتے ہیں کہ "میرزا صاحب نے تو اچھا زمانہ
اور قدردان پبلک پائی تھی پھر وہ اس قدر تنگ دست کیوں رہے"! بے شک

ایک ناواقف کو جس قدر حیرت ہو وہ حق بجانب اس کے ہے، ہم کہتے ہیں کہ بعض اوقات ہم خود حیرت میں آجاتے اور سوچتے ہیں کہ میرزا غالب تو بڑے ہردل عزیز بزرگ تھے وہ اس قدر پریشان حال کیوں رہے؟ خصوصاً اس حیرت کو بعض بزرگان کے اقوال اور ترقی دلاتے ہیں جس جلیل القدر بزرگ کو زوج بتول اور امام ہونے کا مرتبہ حاصل ہوا اور جو بہت آنے والے اماموں کے مورث اعلیٰ ہونے والے تھے (رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین) وہ اپنی زبان فیض ترجمان سے ارشاد فرمایا کرتے تھے اَعَلَّمَنِیْ حَرَفاً فَقَدْ صَیَّرَنِیْ عَبْدًا یعنی "جس نے مجھے ایک حرف بتایا اس نے غلام بنا لیا"۔ یہ ارشاد زوج بتول قبلہ آل رسول حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا ہے (قربانت شوم) اب ایک سرسری نظر مرزا صاحب کے تلامذہ کی طرف دوڑائیے۔ اس فہرست میں آپ والیان ملک اور سرداران قوم اور اکثر صاحبانِ اقتدار کے نام نامی دیکھیے گا۔ جنت آرام گاہ نواب یوسف علی خاں صاحب والی ریاست رام پور سے میرزا صاحب کو جو تعلق تھا اس کا بیان کرنا تو طول امل ہے دو شعر (ص ۸۷) سن لیجیے۔ آپ جان جائیں گے کہ جنت آرام گاہ سے میرزا کو کیا تعلق تھا۔ فرماتے ہیں ؎

نواب مہر مہر منوچہر چہر را　　حاصل جمال یوسف قرب کلیم باد

ایک شعر چھوڑ کر لکھا ہے:

ہردم ترا بخلوت رازدبہ بزم انس　　روح الامیں مصاحب و غالب ندیم باد

جنت آرام گاہ کے سوا، نواب ضیاء الدین احمد خاں صاحب، نواب علاء الدین خاں صاحب بہادر مرحوم و مغفور۔ نواب مصطفیٰ خاں صاحب

مرزا تفتہ وغیرہ کو جو مرزا صاحب سے حسنِ عقیدت تھا وہ محتاجِ بیاں نہیں۔ مگر ہم اپنے ان احباب کی خدمت میں عرض کرتے ہیں جو متحیر ہو کر پوچھتے تھے کہ غالب نے تو اچھا زمانہ پایا پھر کیوں اس افلاس کی مصیبت میں مبتلا رہے۔ جناب والا اگر نظر کو آگے بڑھا کر اور خیال کو وسیع کر کے دنیا کی عام حالت پر غور فرمائیے گا تو آپ کی حیرت رفع ہو جائے گی۔ میں عرض کرتا ہوں کہ ہر دور اور ہر عصر میں بادشاہ۔ امیر۔ وزیر۔ غریب سبھی ہوتے آئے ہیں اور دنیا کی یہی رفتار ہے۔ فردوسی نے کیسا زمانہ پایا؟ اور اس کے ساتھ عصائری جنسے۔ حافظ۔ انوری جس زمانے میں اپنے جوہر کلام سے دنیا کی عام سوسائٹی کو بے خود کیے ہوئے تھے، اس زمانے میں کیا دنیا بادشاہوں اور دولت مندوں سے خالی تھی؟ ہرگز نہیں اور نہ ایسا ہو سکتا ہے۔ اچھا پھر؟ ہائے رونا تو اسی کا پڑا ہے کہ ہر زمانے میں اُن صاحبانِ کمال کی دلجوئی ہو سکتی تھی مگر ہوئی نہیں اگرچہ مرزا صاحب کے معتقدوں کی فہرست پر آپ کی نظر پہنچ چکی ہے مگر مرزا کی حالت آپ کو اب بھی نہایت سقیم اور قابلِ رحم ہی نظر آئے گی کہیں مصرع: "خجلتے نیست اگر بے سروساماں رفتم" کا نالۂ جانکاہ سنیئے گا، کہیں ترکِ وطن پر آٹھ آٹھ آنسو روتے پائیے گا۔ کہیں عزیزوں اور دوستوں کی بے مہری کی داستان دل سے پار ہو جانے والے الفاظ میں سنیئے گا۔ حاصل کلام یہ کہ غریب کو ان ہی داستان ہائے غم کے دُکھڑوں میں مبتلا پائیے گا۔ عام[1] طبائع کے خواص سے بھی بڑھ کر مرزا صاحب

---

[1] یہاں سے نمبر ۱۱ کے عبارات، اس کے پہلے نمبر ۱ کے عبارات۔ کل مضمون از صـ۷۳ تا صـ۸۸

کو دہلی سے بوجہ وطن ہونے کے نہایت محبت تھی۔ جس طرح مرزا رفیع کے تیور دہلی چھوڑنے سے پہلے ترک وطن کے خیال سے بل کی لیتے تھے۔ مرزا صاحب آخر تک اسی خیال پر قائم رہے۔ آخر مجبوریوں کے ہاتھوں دہلی چھوڑنا ہی پڑی۔ لکھنؤ پہنچ کر جو قصیدہ لکھا ہے اس کے پڑھنے کے بعد آدمی اپنے ہوش میں نہیں رہ سکتا۔ ایک جگہ فرماتے ہیں۔ شعر:

چہرہ اندود بگرد و مژہ آغشتہ بخوں   خود گواہم کہ ز دہلی بچہ عنواں رفتم

مصرع: "نہ بدل رفتم ازآں بلکہ بل از جاں رفتم" آگے چل کر لکھتے ہیں، شعر:

داغ حسرت بدل و شکوۂ اختر بہ زباں   منت از بخت کہ بسیار بہ ساماں رفتم

میٹھی زبان فارسی سے جن اصحاب کو شوق ہے۔ انہوں نے مرزا غالب کا فارسی دیوان ضرور دیکھا ہوگا۔ مگر جس غائر نظر سے ان کے کلام کے دیکھنے کی ضرورت ہے شاید اس نظر سے بہت کم احباب نے ملاحظہ فرمایا ہوگا یوں تو اس دیوان کا ایک ایک مصرع نشتر و خنجر سے کم نہیں (ہمارے وہ احباب معاف فرمائیں گے جن کا تخلص نشتر یا خنجر ہے) مگر اس قصیدے کے اشعار میں جو بےخود کر دینے والی کیفیت ہے اس کا مزہ کچھ ہمارا ہی دل اچھی طرح لے رہا ہے۔ میرے ایک معزز دوست نے اپنے واجب التعظیم بزرگ کی زبانی یہ حکایت مجھ سے بیان کی کہ جب مرزا صاحب دہلی کو آخری نگاہ سے خیرباد کہنے پر آمادہ ہی ہو گئے تو میں نے ان سے بوجہ اس تقرب کے جو مجھے مرزا غالب سے حاصل تھا کہا کہ آپ اس قدر پریشان کیوں ہیں اور ترک وطن کیوں فرماتے ہیں۔ اول تو عادت کے موافق ہوں ہاں پر ٹالتے رہے اور جب ہم ادھر ادھر سے

معاصر

بڑھا تو کہا کہ "او میاں تم نے ابوالفرح[1] بن ہندو طبیب کا" وہ قطعہ بھی سنا ہے جس میں
اس نے ہدایت کی ہے کہ "جب آدمی کو اپنے وطن میں ذلت کا سامنا ہونے لگے
تو اسے ترک وطن پر آمادہ ہونا چاہیئے" وہ صاحب خاموش ہو رہے - اپنے دوست
کی زبانی میں ایک دوسرا واقعہ بھی بیان کرنا چاہتا ہوں جو انھوں نے اپنے عالی قدر
بزرگ سے سن کر مجھ سے بیان کیا فرماتے ہیں کہ ایک دن میں مرزا غالب کی خدمت
میں حاضر ہوا اُن روزوں مرزا صاحب کو مختلف افکار کا سامنا تھا - میں نے دیکھا تو
مرزا صاحب اسی طرح جو اُن کی عادت تھی ہنس بول رہے ہیں میری حیرت جب
حد سے گزرنے لگی تو مرزا صاحب سے میں نے کہا "جناب باوجود ایسے معاملات کے

---

[1] میرے نزدیک مرزا صاحب کا مطلب اسی ابوالفرح بن ہندو سے ہے جو بغداد میں پیدا
ہوا تھا اور ابوالخیر بن خمار کا شاگرد رشید تھا جس نے ۴۵۰ھ ہجری میں ایک سخت مرض میں مبتلا
ہو کر جان دی - یہ حکیم بڑا ادیب تھا شاعری میں اس کو بڑا کمال حاصل تھا - اس کے اکثر اشعار
مشہور ہیں - اکثر اطبا نے اس کی تعریف کی ہے - ابن رضوان جو کہ اعلیٰ درجہ کا طبیب تھا ابوالفرح
کی ہمیشہ تعریف کرتا رہا - کتاب منافع میں ابوالفرح کے اقوال سے بہت کچھ دلائل پیش کیے
ہیں - اس حکیم کے عروج کا زمانہ القائم بامر اللہ عباسی کے عہد میں تھا - جو اشعار کے معنی
تصرف کے ساتھ مرزا غالب نے بیان کیے ان کا ترجمہ یہ ہے "جب تجھ کو تیرے
ہموطنوں سے آزار پہنچے تو تجھ کو ترک وطن کر دینا چاہیے کیونکہ اپنے وطن
میں عزت حاصل نہیں ہو سکتی" اس موقع پر وہ ایک مثال دیتا ہے کہ صندل
ہندوستان میں ایک لکڑی کا نام ہے، مگر دوسرے ممالک میں وہ کس درجہ
قابل قدر ہوتی ہے - احمد شفیع — مؤلف

روکش ہونے کے میں آپ کو بے فکر دیکھتا ہوں" مرزا صاحب نے فرمایا "ہاں درست ہے میری جان! میری نظر سے وہ واقعات گزرے ہیں جن کے خیال کرنے سے آدمی کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں اور پھر فرمایا کہ میں نے اپنی آنکھ سے دیکھا کہ ایک شریف زادے سے جو جوہر شرافت کے علاوہ زر و جواہر دنیا سے بھی مستغنی تھا ایک شخص نے مراسم اتحاد بڑھانے شروع کیے، بڑھاتے بڑھاتے یہاں تک نوبت پہنچی کہ اپنی بیبی کی بہن سے اس کا نکاح کہو یا جو کچھ سمجھو کر دیا۔ اس غریب خاتون کو جس قدر خدا نے صورت دل فریب دی تھی اسی قدر دنیا کے منظروں کی زیارت سے اسے بے نصیب رکھا تھا۔ اس درمیان میں اس پاجی خصائل، خود غرض، دوست نے اپنا رسوخ اتنا بڑھا لیا کہ ہمارے نوجوان شریف زادہ نے اپنے ذاتی اختیار میں بھی اس کو دخل دے دیا۔ قصہ تو بڑا ہے مگر مختصر یہ ہے اس شخص کے ہاتھوں جو کسی طرح پندرہ روپے سے زیادہ کا آدمی نہ تھا اس شریف زادے کو وہ وہ مصیبتیں گوارا کرنی پڑیں جن کا بیان نہیں ہو سکتا۔"

مرزا صاحب کے بزرگ عالم شاہ کے زمانے میں دہلی آئے تھے۔ بادشاہ کے دربار میں بہت اعزاز کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے تو مرزا غالب کو دربار گورنر جنرل میں کرسی ملتی رہی خلعت ہمیشہ پایا۔ ۱۷۹۶ء میں مرزا صاحب پیدا ہوئے ۷۲ برس کی عمر پائی ۱۸۶۹ء میں انتقال کیا۔

باوجود اس تنگ دستی کے مرزا صاحب نے اپنی وضع کو کبھی نہ چھوڑا ۱۸۴۲ء میں گورنمنٹ انڈیا کو دہلی کالج کا انتظام فرمانا منظور ہوا۔ ٹامسن صاحب جو اضلاع مغربی و شمالی کے لفٹنٹ گورنر بھی رہے اس وقت سکریٹری تھے ان کا خیال تھا کہ

جس طرح عربی کے مدرس کو سو روپے تنخواہ ملتے ہیں اسی تنخواہ پہ ایک فارسی کا مدرس مقرر ہو تو اچھا ہے۔ مرزا غالب کا حال سن کر صاحب بہادر نے آپ کو بلایا یہ کوٹھی پر گئے اطلاع ہوئی صاحب نے کہا آنے دو مرزا صاحب نہ گئے۔ دوسری دفعہ تاکید ہوئی تو آپ نے فرمایا کہ میرے استقبال کو صاحب تشریف لائیں تو میں حاضر ہوں خدمت گار کی زبانی سن کر صاحب چق اٹھا کر باہر آگئے اور تعظیم کے ساتھ اندر کوٹھی میں لے گئے کرسی پر بٹھایا اور کہا "جناب جس وقت آپ گورنری دربار میں تشریف لائیں تو استقبال کے امیدوار رہیں اب تو آپ ملازمت کی غرض سے آئے ہیں" مرزا صاحب نے جواب دیا کہ "میں تو سرکاری ملازمت کو باعث ازدیاد عزت جانتا ہوں اگر میری بچی کھچی عزت میں بھی فرق آتا ہے تو ایسی نوکری کو سلام ہے" یہ کہا اور اٹھ کر چلے آئے۔

مرزا صاحب نے یہ غزل جس کا مقطع ہمارے مضمون کا عنوان ہے لکھنؤ میں لکھی تھی۔ جب وہ دلی[1] کی ناقدردانی احباب کی بے مہری اغیار کی دل آزاری سے دلی چھوڑ کر لکھنؤ تشریف لے گئے تھے اور وہاں کی قدرداں پارٹی نے ان کو ہاتھوں ہاتھ لے کر اپنے سروں پر بٹھایا تو مرزا صاحب کے حواس بجا ہوئے۔ کچھ دنوں وہاں رہے اور شعر و سخن لطائف ظرائف سے اپنے میزبان احباب کی دلجوئی کرتے رہے۔

---

[1] ہمیں ڈر ہے کہ اہل دہلی خفا نہ ہو جائیں ہم کیا کریں کہ واقعات کے لکھنے میں ہم طرفداری کرنے سے بالکل مجبور ہیں نہیں البتہ بغیر کسی خیال کے ہم سچ لکھ دینے سے دریغ نہیں کریں گے اب اعتراض کرنے والے چاہے کچھ ہی فرمائیں کسی کا منہ بند نہیں کیا جاتا۔

ایک روز چند زندہ دل اصحاب جمع تھے اور مرزا صاحب اپنی سحر نما تقریر سے حاضرین جلسہ کو لبھا رہے تھے کہ ایک صاحب نے اپنے کسی ہم راز دوست کی طرف سے کان میں جھک کر کہا کہ "یہ شخص تو ایسا لائق خوش گو اور ہر دل عزیز شاعر ہے کہ اسے آنکھوں میں بٹھایا جائے تب بھی کم ہے افسوس دلّی میں اس قدر بھی صلاحیت نہیں رہی کہ ایسے اعجوبۂ روزگار کی قدر کرتی" وہ صاحب ابھی جواب بھی نہ دینے پائے تھے کہ مرزا صاحب بول اٹھے "کیوں جناب کیا ارشاد ہوتا ہے؟" سوال کرنے والے سمجھے کہ مرزا صاحب نے سن لیا۔ ندامت سے کہا: "حضرت خیریت ہے" اور پھر اپنا خیال ظاہر کیا۔ مرزا غالب صاحب سن کر بے تاب ہو گئے۔ ایک ٹھنڈی سانس لی۔ دیر تک گردن جھکائے بیٹھے رہے۔ جس سے معلوم ہوتا تھا کہ کسی سخت اور نہ برداشت ہونے والے غم کو ضبط کر رہے ہیں۔ آخر نہ رہا گیا۔ پھر بولے "مجھ ناچیز کی مجھ سے زیادہ قدر کرنے والے دوستو! میں جس وقت عالم وجود میں آیا ہوں تو میرے شفقت کرنے والے والدین نے اسی شفقت اسی محبت سے ہدیہ رحمت سمجھ کر گود میں اٹھا لیا جس طرح ہر بچّے کے وہ والدین جن کو قدرت سے پہلے پہل ایسی نعمت غیر مترقبہ عطا ہوئی ہو اٹھا لیتے ہیں زمانے کے موافق ہونے کے سبب سے، میرے باپ نے دولت کا کھیل دولت کے ڈھیر میں مجھے کھلایا۔ ابھی میں پانچ برس کا تھا کہ میرے باپ عبد اللہ بیگ خاں نے جو آصف الدولہ مرحوم کے عہد میں یہاں (لکھنؤ) بھی آئے تھے الور کی لڑائی میں اس دنیا سے رحلت کی۔ اس کے بعد سے اپنے چچا نصر اللہ بیگ کے دامن محبت میں پرورش پاتا رہا۔ چند روز بعد میرے چچا بھی مرگ ناگہانی میں مر گئے۔ جاگیریں ضبط ہو گئیں۔ پھر بھی ہزاروں

لاکھوں روپیہ موجود تھا اب بھی میری نظر نے بہت عزیزوں کو اپنے حال پر شفقت کرتے دیکھا اور میں بے فکر رہا۔ اور اسی طرح میں بچپن کی بے خودی اور خود فراموشی کے زمانے سے نکل کر جوانی کے باغ کی ہوا کھانے لگا۔ میرے چند روز کے روشناس دوستو! میرے ان عزیزوں نے جو فی الحقیقت دولت کو عزیز رکھتے تھے جو برتاؤ میرے ساتھ کیا میں بیان نہیں کر سکتا۔ آہ کس زبان سے بیان کروں نہیں مجھ سے بیان نہیں کیا جائے گا بس اسی قدر عرض کر دینا کافی ہے۔ شعر

گر دہم شرح ستمہائے عزیزاں غالب   رسم امید ہمانا ز جہاں برخیزد

ہانا کے لفظ پر سننے والوں کا یہ حال ہوا کہ مچھلی کی طرح تڑپنے لگے روتے روتے ہچکیاں بندھ گئیں اور بار بار ہر شخص اس مصرع کے الفاظ کو دُہراتا تھا: مصرع: "رسم امید ہمانا ز جہاں برخیزد" خود مرزا غالب کا جو حال ہوا اس کے لکھنے کے واسطے دل چاہیئے۔ وہ بھی پتھر کا نہیں فولاد کا۔

اللہ اکبر! کیا پُر تاثیر کلام تھا۔ اس وقت بھی اگر دیکھا جائے تو وہی اثر ہے ذرا اپنے دلوں کو دیکھیے اف اف بے طرح دھڑک رہا ہے۔ کلیجا ہے کہ چھاجوں اچھل رہا ہے۔ بے شک سچے واقعات اثر دار الفاظ میں موزوں ہو جانے کے بعد بغیر رنگ دکھلائے نہیں رہتے۔ فقط احمد شفیع از فیروزآباد

ص سلطان محمود غزنوی نے سومنات کی لڑائی کے وقت جب دیکھا کہ دشمنوں کی تعداد بہت زیادہ ہے اور غزنی والے سست ہو چلے ہیں تو قلب فوج سے نکل کر پاٹ دار آواز سے دو شعر شاہنامے کے پڑھے اور سپاہیوں کو

تازہ دم کر دیا ان شعروں کا اثر یہ ہوا کہ دشمن بھاگ کھڑے ہوئے قبیلہ بنی شیبان سے جب نوشیرواں کی فوج کا مقام ذی قار میں مقابلہ ہوا تو ایک شیبانیہ لڑکی نے عین اس وقت جبکہ عرب لوگ پسپا ہونے والے تھے ایک شعر پڑھا اور گویا عربوں میں بہادری کی روح پھونک دی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ شاہی فوج ان بادیہ نشین عربوں سے ہزیمت اٹھا کر بھاگ گئی ۔ یہ شاعری کا اثر نہیں تو کیا ہے؟

احمد شفیع

"تقریظ" دیوان شاد لکھنوی

از عبدالرزاق قریشی

شاد لکھنوی عرش خلف میر تقی میر کے شاگرد اور دو دواوین مطبوعہ کے مالک تھے۔ ان کے حالات زندگی ان کے تلمیذ و معتقد عشرت لکھنوی نے آب بقا میں لکھے ہیں، اس لیے اس موقع پر ان کا اعادہ لاحاصل ہے۔ اس مقالے کی غرض اس "تقریظ" کا منظر عام پر لانا ہے جو شاد نے اپنے پہلے دیوان 'سخن بے مثل' (= ۱۲۹۲) پر لکھی تھی۔ جیسا کہ اس مقالے سے واضح ہوگا، یہ لسانی اور شعری نقطۂ نگاہ سے خاص اہمیت رکھتی ہے:

"بعد حمد خدائے سخن آفرین و نعت ختم المرسلین و منقبت امیر المومنین خوشہ چین سخنوران محمد جان بن شیخ وارث علی ولد شیخ فضل علی شیخزادہ لکھنؤ نسل سے محمد بن ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے متخلص شاد مشہور بیر و میر حوالۂ قلم کرتا ہے کہ سخن فہمان فصیح اللسان اور شعرائے نکتہ داں پر واضح ہو کہ زمان سلف میں شعرائے ریختہ گو اکثر سلک نظم میں الفاظ فارسی خلاف تلفظ اردوئے معلی منسلک کرتے تھے اور الفاظ ثقیل ٹھیٹھ ہندی اور الفاظ غیر فصیح بھاکھا استعمال میں لاتے تھے اور بہت الفاظ غلط جو زبان عوام پہ تھے بندش اشعار میں صرف کرتے تھے، مگر سنہ ۱۱۶۸ ہجری عہد محی الدین عالمگیر پادشاہ میں شاعر عالی فہم، متخلص بہ حاتم دہلوی نے زبان مروجہ کے عیوب ظاہر کیے اور الفاظ غلط و ثقیل نظم کلام سے خارج کر دیے اور جو روزمرہ

عام فہم اور خاص پسند مرزایان دہلی کا تھا اُس کو اختیار کیا اور ایک دیوان پر کہ موسوم بہ دیوان زادہ ہے مشتمل تقریظ کے لکھ دیا اور یہ طریقہ شعراے نامی ہمعصر سے اکثروں کو مطبوع ہوا چنانچہ شرف الدین مضمون و شیخ احسن اللہ احسن و میر شاکر ناجی و غلام مصطفےٰ یکرنگ و شاہ مبارک آبرو و میرزا جان جانان مظہر وغیرہ نے اس روش کو تسلیم کرلیا۔ شمہ ان لفظوں سے کہ جو معیوب قید کی گئی ہیں الفاظ فارسی و عربی و ٹھیٹھ ہندی اور بھاکھا سے بیان کیے جاتے ہیں مثلاً "درو" "برو" "ازو" "او" کہ فعل و حرف ہیں بقول آبرو : ؎

جو کہ لاوے ریختہ میں فارسی کے فعل و حرف لغو ہیں گے فعل اس کی شاعری میں حرف ہے

اور الف منادی خلاف تلفظ اردوے معلٰی جیسے دلا و ناصحا و نون جملہ بالاعلان جیسے گلچین و مہجبیں و نون اعلان بالمضاف (کذا) جیسے دل ناتوان و تن بیجان و لفظ عربی بالمضاف بامصدر فارسی جیسے بعد مردن دیا۔ جمع عربی کے ساتھ جمع ہندی کی جیسے اغیاروں میں اور اعمالوں میں و لفظ عربی مضاف و مضاف جیسے آفتاب بالخسوف و مہتاب بالکسوف دیا الفاظ عربی و فارسی متعرفہ عوام واجب الصحت متحرک کو ساکن ساکن کو متحرک کرنا جیسے مَرَض کو مَرْض اور غَرْض کو غَرَض و تَخْت کو تَخَت و سَخْت کو سَخَت کہنا یا الفاظ عربی و فارسی با تخفیف جیسے تسبیح کو تسبی اور صحیح کو صحی اور بیگانہ کو بگانہ اور بیچارہ کو بچارہ اور دیوانہ کو دوانہ یا الفاظ بھاکھا با تخفیف جیسے یہاں کو یاں اور وہاں کو واں اور جیسے کو جیسے اور کیجے اور کیوار اور ہراک کو ہر یک مخرج تنگ ہوتا ہے اور الفاظ زائدہ بھاکھا جیسے ہو کو ہووے اور ہے کو ہیگا اور تک کو تلک اور جس طرح کو جس طرح سے اور سے کو ستی اور سیتی

اور ادھر کو ایدھر اور کدھر کو کیدھر اور لفظ تجھ بعضی جا مناسب اور بعضی جا غیر مناسب
ہوتی ہے جیسے تجھ چشم نے اور تجھ نگاہ نے محاورہ نہیں ہے اور تیری چشم نے اور
تیری نگاہ نے چاہیے کہنا اور لفظ غنثی جو تانیث اور تذکیر تلفظ کی جاتی ہے
جیسے بلبل بولی اور بلبل بولا اور طرز اچھی اور طرز اچھا دونوں طرح جائز ہے لیکن
باقاعدہ جمع ہندی جو ہو اولی ہے یا لفظ مار اور مرا اور اڑانا و دھر دانا اس قبیل سے کہ
قباحت اوپر اپنے ہو لازم نہیں ہے یا لفظ ٹھیٹھ ہندی جیسے نین و جگت و نت و بسر
و سجن مگر ہائے ہوز کا بدل کرنا ساتھ الف کے بیچ قافیہ کے عام و خاص کا محاورہ
ہے بندہ بیچ اس امر کی متابعت جمہور سے مجبور ہے جیسے بندہ کو بندا و شرمندہ کو
شرمندا لیکن ترک اس کا اولی ہے یا قافیہ لفظ قریب المخرج عربی جیسے وحی و نہی غزل میں
ناجائز ہے اور مثنوی وغیرہ میں بھی ترک بہتر ہے یا قافیہ ساتھ فتح و ضم رائے ہندی
کے جیسے دوڑ اور توڑ مع الف وصل ماضی مطلق جیسے دوڑا و توڑا یا قافیہ رائے ہندی
کا ساتھ رائے فارسی سے جیسے کوڑا و کورا دونوں ناجائز ہیں اور مانند اس کے اور
مثل کل الفاظ معیوب منقیدہ مرقومہ بطور عامہ اور قافیہ کلمہ واحد آخر مصرع سے ہے
نہ حرف آخر ساکن مفرد اور الفاظ مدولیں مثلاً یہیں اور وہیں اور یں اور ایک یا۔ دو حرف
برابر گرتے ہیں اور حرف علت بھی گرتے ہیں۔ لیکن گرنے سے نہ گرنا اولی ہے اور عیب
تحفیہ کہ ناگزیر ہے جہاں تک نہ ہو بہتر ہے اور اصول افاعیل عربی سے مشتق ہیں اور قاعدہ
عروض سے کہ بیشتر وزن کے استنباط کیے گئے ہیں کہ نام اوس کا پنگل ہے اور نہیں مشتمل ہیں
قاعدہ عروض فارسی سے۔ یہ چند کلمے واسطے طالبان اس فن کے بطریق اختصار لکھ دیئے
تا فائدہ اٹھائیں خیر الکلام ما قل و دل اور اکثر یہ کہتے ہیں کہ ایک شاعر مترجم بے مہر نشار نے

عہد غازی الدین حیدر شاہ اودھ میں یہ اختراع کیا ہے اور پیشتر مثل اوسی مترجم بے مرشد کے جناب شیخ ناسخ مرحوم کے نامزد کرتے ہیں کہ یہ تراش خراش اونہوں نے کی ہے اور ایک آدھ مونڈا ہوا اوسی مترجم بے مرشد کا اپنا نام لیتا ہے کہ یہ جہان بنان میں نے کی ہے یہ سب دروغ گو ہٹ دھرم حق پوش جھوٹے ہیں اور یہ بے پیرے ماہیت زبان اردو میں نہیں رکھتے ہیں۔ یہ ریختہ سرائی نہیں کر سکتے۔ بیت مولف ؎

کیا ریختہ سرا ہوں یہ روہیں کسی کے　　مونڈے جو بالکے ہیں بے مرشدے گرد کے

ناظرین سے پوشیدہ نہیں ہے کس واسطے کہ الفاظ معیوب متفیدہ حاتم دہلوی ہر ایک کے کلام میں موجود ہیں مگر الفاظ قبیح متفیدہ مذکورہ سے متقدمین نے حرف فعل فارسی موقوف کیے اور متوسطین خواجہ درد اور میرزا سودا اور میر جان مکین وغیرہ نے کچھ ٹھیٹھ ہندی الفاظ اپنے کلام سے نکال ڈالے اور اوسی طرح الفاظ معیوب متفیدہ مذکورہ کم دیش پیش تمامہ میر زبان دان میر عرش طوطی ہندوستان اور مولف ہیچمدان خوشہ چین سخنوران شاد پیر و میر نے اوستاد کے فرمانے سے ۱۲۴۵ ہجری عہد نصیر الدین حیدر شاہ اودھ میں اپنے کلام سے خارج کیے اور الفاظ متروکہ کو اس قطعہ تاریخ ترتیب دیوان میں موزون کر دیئے اس نظر سے کہ ہر شخص فائدہ اوٹھاوے۔ قطعہ!

حسب ارشاد حضرت اوستاد　　یوں مرتب کیے ہیں دو دیوان
قافیہ اک میں ہندیوں کی طرح　　اک کی بیتوں میں مثل فارسیاں
از نہ بر ہے نہ لبد هر دن ہے　　نہ منادٰی الف کا سان و گمان
نون جملہ ہو یا مضافی ہو　　نہیں ہر دو یہ نون با اعلان
فارسی لفظ با لمضاف نہیں　　عربی لفظ ہے مضاف جہان

پاک تخفیف سے تلفظ کے | جیسے کیجیے 'دوانہ' 'اریاں' 'داں'
آن کے جس طرح سے ہو سکا تلک | نہیں کل حرف زائدہ کا نشاں
حرف بے قاعدہ نہیں گرتے | قافیہ کا بھی جا بجا ہے بیاں
بیشتر لکھ دیا ہے بیتوں میں | عیب ایطا و شایگاں ہے جہاں
نہ مجرد کے ساتھ ہے نا سہیں | دیکھ لیں اس کو سارے قافیہ داں
سال ترتیب ہے یہ مصرع شاد | نوحہ ہم عروض و ہم دیواں

۱۲۹۱ ھ

ایضاً از مصنف

بگشت طبع چو دیوان شاد چوں تصویر | نگار خانہ مانی مرقعہ بہزاد
قلم نوشت ز دیوان شاد تاریخش | چہار چند مات کن ز تابکن آحاد

۱۲۹۲ ھ

اور اہل بدایع بعضے تاے مدورہ کے پانچ عدد لیتے ہیں اس وجہ سے کہ تاے مدورہ بجز ہاے مدورہ کے حروف ہجی میں وضع نہیں ہوئے اور بعضے چار سو عدد لیتے ہیں ۔ اس وجہ سے کہ علامت تاے فوقانی نقاط ہیں اور یہ دونوں وجہیں منقول ہیں ۔ لیکن ضرورت میں دونوں جائز ہیں اور مورخین تے کو دال سے حسب ضرورت بدلتے ہیں جیسے کتخدا کو کدخدا اور بے کو واو سے بدلتے ہیں یعنے بابا کو باوا اور رے کو لام سے بدلتے ہیں جیسے دیوار کو دیوال اور اسی طرح اکثر حروف سے حروف ساتھ قاعدہ کے بدلتے ہیں ۔ اور مورخین نے حروف کی چار قسمیں کی ہیں ۔ اول آحاد دوسری عشرات تیسری مآت اور چوتھی الوف ۔ اور کبھی آحاد جمع احد سے حسب ضرورت لیتے ہیں لیکن لینا معیوب ہے ایضاً قطعہ تاریخ کو واسطے مثال کے عنوان دیوان میں لکھ دیا تا معلوم ہو ۔

خواب و خیال کا نسخۂ علیگڈھ

از عابد رضا بیدار

اثر کی مثنوی خواب و خیال پہلی بار سنہ ۱۹۲۶ء میں معرض طبع میں آئی، اور دوسری بار ۲۵ برس کے بعد سنہ ۱۹۵۱ء میں چھپی۔ کہا جاتا ہے کہ "نقاش نقاش ثانی بہتر کشد ز اوّل" لیکن طبع ثانی سے اس قول کی تصدیق نہیں ہوتی۔ متن کی درستی میں کسی نئے نسخے سے مدد نہیں لی گئی اور یہ پہلے سے بہت زیادہ غلط ہو گیا ہے؛ مقدمہ اس کے ساتھ بھی وہی ہے جو طبع اوّل میں شامل تھا۔ سابق اغلاط اپنی جگہ پر ہیں اور اثر سے متعلق سنہ ۱۹۲۶ء کے بعد سے جو نئی باتیں معلوم ہوئی ہیں، وہ اس میں موجود نہیں۔ کمال یہ ہے کہ دیوان اثر کے ناپید ہونے کے بارے میں جو بات سنہ ۱۹۲۶ء میں لکھی گئی تھی وہ دیوان کے انطباع کے بعد بھی مقدمے سے خارج نہیں کی گئی۔ ایک ادبی ادارے کا اتنے مستند شاعر کی تصنیف کے ساتھ یہ سلوک بے حد افسوسناک ہے۔

خواب و خیال کا جو قلمی نسخہ مسلم یونیورسٹی علیگڈھ کے کتب خانے میں ہے، وہ کاتب اور زمانۂ کتابت سے متعلق اطلاعات سے خالی ہے، لیکن اس کے ساتھ ایک ہی جلد میں جو کتابیں ہیں، ان میں سے ایک سورۃ الحمد کی منظوم تفسیر ہے جس کا زمانۂ کتابت ۱۲۴۶ھ ہے اور جو غالباً اسی کاتب کی لکھی ہوئی ہے، جس نے مثنوی کی کتابت کی ہے۔

طبع اول مبنی، برد و مخطوطات مرتبۂ ڈاکٹر عبد الحق صاحب شائع کردۂ انجمن ترقی اردو ہند = الف، طبع ثانی مرتبۂ ایضاً شائع کردۂ انجمن ترقی اردو پاکستان = ب۔

اس سے مؤخر الذکر کے زمانۂ کتابت کی کسی حد تک تعیین ہو سکتی ہے: اس نسخے = ع سے بعض اشعار غائب ہیں اور اس میں عنوانات نثر کی جگہ سادہ ہے۔ جہاں تک املا کا سروکار ہے، دو تین باتیں قابل ذکر ہیں: الف کے برخلاف، ع میں سے دنے بدون نون ہے اور وہ بیشتر دہی ہے اور کمتر دو۔ اس نسخے کی مدد سے الف کے متعدد اغلاط کی تصحیح ہو سکتی ہے اور اس کے اشعار میں ۳ کا اضافہ ہو سکتا ہے۔

ذیل میں الف و ع کے اختلافات نسخ کا ذکر کیا جاتا ہے، اور الف کے کچھ ایسے اغلاط کی نشاندہی بھی کی جائے گی جو محض غلط خوانی کی وجہ سے ہیں۔ ع کے بعض اغلاط کی طرف بھی اشارہ کیا گیا ہے۔ اول صفحۂ الف کا شمار دیا گیا ہے، اس کے بعد الف کا شعر یا مصرع، اس میں الفاظ توجہ طلب نشانزد ہیں پھر ع اور اس کے بعد نشانزد لفظ یا الفاظ کی جگہ وہ لفظ یا الفاظ جو ع میں ہیں درج ہیں۔ مصرع یا شعر الف کے بعد قوسین کے اندر الفاظ کا ہونا صرف ان مقامات پر استعمال ہوا ہے، جہاں فاضل مرتب کی غلط خوانی کی طرف اشارہ مدنظر ہے:

ص۱ "سخت آفت بہ بحر قلزم ہے جو پڑا اس میں خیر بھر گم ہے" مرتب کا حاشیہ ہے کہ دونوں نسخوں میں خیر ہے، لیکن، مقام "غمر" کا ہے۔ ع میں "خیر بھر" کی جگہ "خبر پھر" ہے، اور یہی صحیح ہے ص۲ "نظر یا کبھی نہ پاٹ اس کا" ع "دیکھو ہٹ" "قطرۂ آب نزع میں نہ جائے" مرتب نے لکھا ہے کہ دونوں نسخوں میں یہی، مگر "چواٗے" چاہیے، ع میں بھی ہے ص۳ "اپنی صورت سے احتیاج نہ ہو" مرتب کا قول ہے: "اپنی ۔۔۔ بے محل ۔۔ کیا عجب کہ "اتنی" ہو" یہ قول خود بے محل ہے۔ تبدیلی کی حاجت نہیں، ع میں "اپنی" ہی ہے۔ ص۳ "اپنا ہی گوں ۲ تکے

ہے سب کوئی" ع "اپنے ہی کو ملے" صہ۴ "اپنے مارے ہوئے اور جیتا ہے" ع "یہ" صہ۴ "بے خودی سے یہاں خدائی سے بیر" ع "کو" صہ۴ "نفس شیطان کی کریں ہیں خوشی" ع "نفس و شیطان" صہ۴ "مار دہیر سے ہلاک کرے" ع "اسے" صہ۴ "ہے محبت محبت اللہ" ع "للہ" صہ۶ "گو کریں وے ہزار گونہ کلام" ع "وہ" صہ۶ "کھول دے ہے حقیقت ہر امر" ("کھول دے" غلط "کھول دی" چاہیے)۔ صہ۶ "ظاہر گفتگو بہانہ ہے" ع "ظاہرا" صہ۶ "ایک ہی طرح یہ نکالی ہے" ع "اک نئی طرح" صریحاً غلط ہے۔ صہ۷ "ہیں مضامین بہت شوخ و شنگ" ع "مضامین بہت سے" ب میں "مضامین بہت ہی" صہ۷ "کام مجھ کو کسی کے ساتھ نہیں" ع "کسو" صہ۷

"کبھو عرش برین کی میں کہوں کبھو باتیں زمین کی میں کہوں"

ع "بریں" اور "زمیں" بنون غنہ اور دونوں مصرعوں میں "کہوں" کی جگہ "کہدوں" صہ۸ "لغو بیہودہ ہیچ پوچ کلام" "لغو" اور "ہیچ" کے بعد "و" صہ۸ "عالم دوستی سے ہو کے خبر" ع "ہوگی" صہ۹ "ذہن میں اپنے چاہیے سو سمجھے" ع "جو" صہ۹ "بے خبر منہ سے نکلے جاوے ہے" ع "نکلا" صہ۹ "کہیں گوئی کچھ اور چیز دگر" ع "ذکر" مگر یہ صریحاً غلط۔ صہ۹ "یہی اشعار ہیں بنائے کلام" ع "وہی" صہ۱۲ "ظاہرا پرے کسو پہ شیدا ہے" ع "یہ" صہ۱۲

"جا پڑے ہے جب اسطرف کو نگاہ اسکی حالت کرے ہے حال تباہ"

"جا پڑے ہے جب اسطرف کو نظر اسکی حالت کرے ہے دل میں اثر"

ع میں دوسرا شعر اور یہی حاشیۂ الف میں ہے۔ صہ۱۴ "نخفا بلب تشنہ مثل خم خاموش"

ع "بستہ" صـ۱۷ "طفل شوخ ہزار مہر و وفا" ع "مرا پہ" صـ۱۷
"غم کسو کے گھٹائے گھٹتا ہے یا کسو کے مٹائے مٹتا ہے"
ع "بٹائے بٹتا" صـ۱۸ "بے طرح کچھ گھلائے جاتا ہے" ع "گھلا ہی" صـ۱۹
"یک نظر را نمودی ورفتی" ع "رو" صـ۱۹ "رابطہ تازہ آشنا یہا" ع "رابطہ"
صـ۲۰ "آہ برآورم زسینہ چناں" ع "چسپاں" صـ۲۱
"لے خبر تیغ یار کھنچتی ہے باقی اس نیم جان میں کچھ ہے"
ع "کھنچتا ہیں" صـ۲۲ "دل پہ بے اختیار ہو کر آہ" ع "بہ" صـ۲۴ "سخت ناچار
ہو گیا تھا یہ" ع "کہا تھا" صـ۲۴ "باتیں سو سو سبھوں کی سہتے ہیں" ع "سبھی"
صـ۲۵ "بن کہے کیونکے جی میں آوے گا" ع "کس کے" صـ۲۶ "کتنے بندوں کو جان
سے کھویا" ع "مارا" صـ۳۱ "لے خبر کرلے دست اندازی" ع "کر کے" صـ۳۴
"یک دو حرف اگر زمن شنوی" ع "یک دو حرفے" ب "یک دو ہم حرف" صـ۳۷
"شمع ساں جلتے بلتے کاٹی ہے" ع "عمر" صـ۳۸ "کچھ ہی باقی ہے مجھ میں تاب
کی بات" ع "بات" صـ "تاب ہے" صـ۴۲ "دل کہیں ہیں کہیں دھیان کہیں" ع "کہیں توں"
صـ۴۵ "چھوٹتی ہے یہ بد معاملگی" ("چھوٹتی ہی" چاہیے) صـ۴۶ "شکوہ بے اختیار
کرتا ہوں" ع "شکوے" صـ۴۷ "نہ سنا تھا کسو نے یہ تو غرور" ع "یہ" صـ۵۱
"بن ملے دل تو رہ نہیں سکتا" ع "تو ہیں" صـ۵۲ "پہلے گو نالہ تو کیا ہی نہیں"
ع "بھلے کر نالہ" صـ۵۲ "دل جو آیا نہ اب نہیں شاید" ع "نانک" ب "تیں"
صـ۵۳ "دفتر شکوہ جب سے کھولوں ہوں" ع "کہ" صـ۵۵ "دیوے ہر ایک
رت جدا ایذا" ع "جدی" صـ۵۷ "نعرہ بھرتا ہوں آہ کرتا ہوں" ع "نعرے"

ص۵۸ "نالہ کرتا ہوں آہ بھرتا ہوں" ع "نالے" ص۵۹

"آدمی گر ترا نظر آیا تو تو پھر حرف جان پر آیا"

ع ردیف "آوے" شعر بالا کے بعد ع میں شعر ذیل جو الف یا ب میں نہیں:

"دیکھنے شادی مرگ ہوتا ہوں اُلٹے اس کے حواس کھوتا ہوں"

ص۶۲ "جلوہ گہ ہے اسی کی جلوہ گری الخ" ع "جلوہ گر" ع میں شعر بالا سے قبل شعر ذیل جو الف یا ب میں نہیں:

"سب جہاں جلوہ گاہ اس کا ہے سارا عالم گواہ اس کا ہے"

ص۶۵ "تو کجا و رقیب نیز کجا" ع "تیز" ص۶۵ "دشمن ماست زندگانی ما" ع "بدگمانی" ص۶۷ "باتیں الفت کی جد سناتے تھے" ع "جا" ص۷۱ "خوب نگینی ملی دلی صورت" ع "نگی" ص۷۳ "قصہ العشق کو بنیر نہیں" ع "قصہ عشق" ص۷۳ "نہ رہوں پھر میں تیرے ساتھ کبھو" ع "ملوں" ص۷۴ "یہ نہیں دم میں گڑگڑانے لگے" ع "گڑگڑانے" ص۷۷ "الفت ان کی دلی نہ ظاہر ہو" ع "دلی" ص۷۹ "پیٹ بھر بھیٹ لادیے ان کے" ع "پیٹھ" ص۸۲ "کھلے آنکھوں مجھے نظر آنا" ("کھلی" چاہیے) ص۸۲ "بخت سے دون تو دوں تشبیہ" ع "اپنے دوں تو دوں" ص۸۳ "جس گھڑی یاد سے وہ اڑتی ہے" ع "باد" ص۸۳ "ہے مری جان و دل بھی اس کی نیاز" حاشیہ الف "مرا" یہی ع میں ہے۔ ص۸۴ "خاک ملتا ہے منہ کو آئینہ" ع "پہ" ص۸۵ "اور سب چہرہ بازیوں کے سوا" ع "چھچھر بازیوں" ص۸۷ "جامہ آفتاب جھلکے ہے" حاشیہ: "چھلکے" ع میں بھی "چھلکے" ص۸۹ "کیا کہوں اب کچھ اور وصف دہن" ع "خیر اور" حاشیہ الف میں بھی یہی۔ ص۹۵

(مقطع "قافیہ شادمانی" ردیف "نا" آخر غزل میں ہونا چاہیے اور ع میں بھی اسی طرح ہے، لیکن الف میں مقطع کے بعد اسی زمین کا ایک اور شعر ہے ترتیب ٹھیک نہیں)

ص ۹۲ "...ل مارے ہیں اختر انبال" ع "جال" ب "سال" ص ۹۲ "شرم کے مارے لپٹ ہو جاویں" ع میں اس شعر کی ردیف دونوں مصرعوں میں "جاوے"

ص ۹۳ "کب ہوئی تیری چشم کی تعریف" ع "جسم" ص ۹۴ "دیکھئے واں نگاہ پھیلے ہے" ع دونوں مصرعوں میں "پھسلے ہے" ردیف ص ۹۴ اب سخن کے مری سمائی نہیں" ("کی" چاہیے) ص ۹۴

"اسی انداز پر دہانا ہے   دونوں کا ایک شامیانا ہے"

ع "سامیانا"

ص ۹۶ "منہ جو شکر گھی سے میٹھا ہو" ع "کھے" ص ۹۶ "بن سکے تو کھڑے کھڑے یکبار" ع "گھڑی گھڑی" ص ۹۶ "زندگی کیسی کوئی بات نہیں" ع بجائے الف "کچھ بھی" ص ۹۷ "ہے نئے طور کا مجھے آزار" ع "ہے نئی طرح" ص ۹۸ "رفت جو رفت برون زحد بسیار" ع "زحد شمار" ص ۱۰۰ "مل سکے تو قصور مت کرنا" ع "ملنے سے" ص ۱۰۱ "کہ نہ ہنسنے میں رو دیا ہوگا" ع "ہنستے" ص ۱۰۱ "گریہ راہم والے خوشی باید" ع "دلے خوشے" ص ۱۰۴ "پھر خدا دیوے اب مجھے بھی ضبط" ع "پر"

ص ۱۰۷ "باو جیسے اڑا کے لاوے خس" ع "باؤ" ص ۱۰۸ "جی لیے پہ کبھی رہے دشمن جاں" ع "رہیے" ص ۱۰۸ "واہ وہ دل کی دیکھ چاہ کا رنگ" ع "واہ واہ"

ص ۱۰۸ "ایسے شاہد گواہ کرنے کو" ع "اس پہ" ص ۱۰۸ "دل کا آئینہ نت ہے جلوہ فیروز" ع "فروزی" ص ۱۰۹ "گرچہ کار رم ہنوز باقی ماند" ع "گرچہ" ص ۱۱۰

"نشنیدی، بخواب ہم گاہی" ("گاہے") ص۱۱۰ "نشہ رنج خمار ہا دارد" ع "تشنہ" ص۱۱۱ "لبیک تو آپ نہ وڑے جاتا ہے" ع "ایک" ص۱۱۲ "اور تو کیا تجھے نہ تھا معلوم" ع "اور کیا کیا" ص۱۱۳ "کھینچ لا دے ہے مجھ کو تیری طرف" ع "کھینچے" ص۱۱۳ غزل فارسی میں ع میں شعر ذیل زائد:

"دست کوتاہ وقصد زلف دراز طالعم پست وہمت است بلند"

ص۱۱۴ "دل یہ حیرت رہے ہے شدت سے" ع "تھی" ص۱۱۴ "دل کبھی آپ میں جو آتا تھا" ع "دکبھو" ص۱۱۴ "ہم تو اتنے بھی روشناس نہیں" ع "اتنا" ص۱۱۴ "بیوفا کچھ تری نہیں تقصیر" ع "نہیں تری" ص۱۱۶ "عشق نے تیری اور حالت کی" ("میر ہے") "دل کے اوپر کسو کا زور نہیں، ورنہ سوجھی ہے کوئی کور نہیں" ("سوجھے")۔

تصحیح ص۹۲ سطر ۲ شامل تھا کے بعد "سابق" کی جگہ "تقریباً کل سابق" ص۹۶ سطر آخر و ص۹۷ سطر ۱ و ۲ ص۹۶ سطر ۲ کے بعد ہونی چاہیے۔

ادارہ کتبخانہ مشرقیہ پٹنہ میں ایک قدیم خطی نسخہ خواب وخیال کا ہے جس کے کاتب نے اپنا نام اور زمانہ کتابت نہیں لکھا۔ یہ جا بجا سے دیکھا گیا، ع مطابقت ظاہر کرتا ہے۔

انشا کا غیر مطبوعہ کلام

ازقاضی عبدالودود

کتبخانہ دانش گاہ پٹنہ میں دیوان انشا کے کئی نسخے ہیں، نسخہ ۲۹۷ سے کچھ ایسے اشعار جو دیوان مطبوعہ میں شامل نہیں، درج ذیل کیے جاتے ہیں:

اک شخص کی پسند سجاوٹ نئی ہوئی
پیدا ہمارے دل کو لگاوٹ نئی ہوئی

آہٹ یہ کس کی تھی کہ مرے دل کو لگ گئی
اے باد صبح دیکھیو آہٹ نئی ہوئی

پیاس بجھتی ہی نہیں اس رند عالی ظرف کی
لا دھواں دھار اور ساقی اک صراحی برف کی

سن قیس نے یہ نالۂ شب گیر ہمارے
لیلیٰ سے کہا ہیں یہ گرو پیر ہمارے

اس کی ذقن کی یاد میں پی کے شراب سیب کی
جھاڑ گیا نشے میں میں قاب کی قاب سیب کی

چھٹ ابر غم گیا تو شرارے نکل پڑے
اک بار آسماں کے ستارے نکل پڑے

اور ہی لوگوں سے یہ قضیے بکھیڑا کیجیے
بس خدا کے واسطے مجھ کو نہ چھیڑا کیجیے

دختر رز کی یاد میں یوں جی میں آیا بہر شغل
شیشۂ خالی ہی میں انگلی گھسیڑا کیجیے

گل کھلا جب اور ہی تب کہتی یوں بلبل گئی
دیکھیے اب آگے کیا ہو بند ہی مٹھی کھل گئی

نہ فقط یہ بوئے مے ہی مجھے گدگدا رہی ہے
کہ بہار خود بغل میں مجھے کلبلا رہی ہے

اری عندلیب نالاں مجھے مت ستا رہی تو
ابھی اور لے رہا ہوں تو کچھ اور گا رہی ہے

تری ٹھنڈی سانسیں لینی اے صبا گئی خوش آ
ارے اس گھڑی طبیعت مری سنسنا رہی ہے

دیکھ کر مجھ کو دشمن نیلے پیلے ہو گئے
پردہ میں نے چست کیں باتیں کہ ڈھیلے ہو گئے

چاندنی میں ہم یہ کرو یا دیں اس کی کہ بس — تھے جو قرص مہ سے گل تکیے وہ گیلے ہو گئے

میں بلایا انھیں تو وہ ضد سے — کہہ کے یہ اور بھی پرے کو گئے

انھیں باتوں سے کل گئی ضبا — کوتوالی چبوترے کو گئے

دل دہے کے آبلہ جوں اکروٹ مول لائے — بازار ہم گئے تھے اک چوٹ مول لائے

پونا میں جوں ستارہ اک مرہٹے بھی اس سے — دو سو روپے کو جاکر اک جوٹ مول لائے

نیلام کا تماشا کیا دیکھنے سدھارے — گویا الم کی واں سے اک پوٹ مول لائے

بازار اٹھ گیا یاں سائیں کے ناشتے کو — ہم فیل خانے جاکر یہ روٹ مول لائے

انشا کی انگلی پکڑے چل گھر کو اپنے اور کہہ — ہم یہ غلام جاکر لہلوٹ مول لائے

اُٹھ کیا ساریاں نے لی جلدی کی — دل لیلیٰ میں گویا گدگدی کی

شدی معشوق تجھ سے سن کے بولے — شدی لایا ہے وقت تیری شدی کی

طلب کرتا ہے زاہد گاؤ دیدہ — ہوس تو دیکھیے اس گاودی کی

لینے والے دل کے اپنے سیکڑوں ہیں ہر طرف — تخلیہ کیا آپ رکھتے ہیں تکلف برطرف

ماخوذ از نسخہ ۲۶۴

مجھے ہے درِ خاں پہ ہوس سجود باقی — ہے دم میں جب تلک ہے یہ دم اور درود باقی

دیدہ و دانستہ جب تم نے مروت چھوڑ دی — کیا کریں تب ہم نے بھی صاحب سلامت چھوڑ دی

نشاں ان کا ہے جہاں مسجد کا اب یہ انڈے — اور بہشت نے یہ چادر مہتاب پر انڈے

عشق کا دامن لیا اک اڑتلے کے واسطے — ورنہ کافی تھا جنوں بھی ولولے کے واسطے

ملامت اسے جوں بھیرے دل ناشاد کا نقشہ — کہ یہ کھینچا ہوا ہے اک بڑے استاد کا نقشہ

تعیین زمانہ

از قاضی عبدالودود

محمد علی، حشمت دہلوی، شاگرد قبول واستاد تاباں کے استاد بھائی اخلاص نے ہمیشہ بہار (سال اتمام سنہ ۱۱۳۶ھ) کے نسخہ پٹنہ (= نسخۂ کتبخانۂ مظفریہ پٹنہ) میں ان کی نسبت لکھا ہے: "باوجودیکہ سنش از سی تجاوز کردہ لیکن تماشای ہم اند نوجوانان شانزدہ سالہ دلکش است" اس سے ظاہر ہے کہ ان کی پیدائش سنہ ۱۱۰۶ھ سے قبل ہوئی تھی۔ اشپرنگر نے بحوالۂ قائم و گردیزی تحریر کیا ہے کہ سنہ ۱۱۵۸ھ میں مراد آباد گئے اور لڑائی میں مقتول ہوئے، لیکن قائم و گردیزی نے مراد آباد جانے یا وہاں لڑائی میں مارے جانے کا سنہ نہیں دیا۔ خمخانۂ جاوید جلد ۲ میں مرقوم ہے کہ یہ لڑائی سنہ ۱۱۸۸ھ میں ہوئی، مگر اس بیان کی کوئی سند اس میں مندرج نہیں۔ یہ سنین غلط ہیں، لڑائی سنہ ۱۱۶۱ھ میں ہوئی ہے (سیر المتاخرین)۔ تاباں نے ان کا ایک مرثیہ لکھا ہے، جس کے آخری بند سے اسی سنہ کا پتا چلتا ہے:

تیرا تاباں غریب و خستہ جگر فکر تاریخ میں تھا جو مضطر
مصرع آخری پہ کی جو نظر "کد" سے الف نے اسکو دی یہ خبر
"ہائے حشمت شہید، واویلا" (دیوان مطبوعہ)

میر شمس الدین، فقیر دہلوی۔ ولادت سنہ ۱۱۱۵ھ (ریاض الشعرا، مصنفہ والہ داغستانی نسخۂ پٹنہ)۔ گلشن ہند کی اشاعت اول و ثانی میں سال وفات سنہ ۱۱۷۰ھ

مرقوم ہے، لیکن جہاں تک مجھے یاد ہے کاما اورینٹل انسٹی ٹیوٹ کے خطی نسخے میں سنہ ۱۱۷۰ھ لکھا ہوا ہے[1]۔ اشپرنگر[2] و شیفتہ[3] نے بھی یہی تحریر کیا ہے، اشپرنگر نے ترجمۂ تقی کے آخر میں یہ اضافہ کیا ہے کہ ابوطالب کی لب السیر میں سنہ ۱۱۸۱ھ سال وفات بتایا گیا ہے۔ یہ کتاب میری نظر سے نہیں گزری، لیکن ابوطالب کے خلاصۃ الافکار (نسخۂ پٹنہ) میں یہ عبارت ملتی ہے: "در سنہ ۱۱۸۰ .. بعزم ادائے حج .. سوار جہاز شدہ سفینۂ حیاتش با جمیع اہل کشتی درگرداب ممات تباہی گشت"۔ صحیح بیان شفیق کا ہے، وہ گل رعنا (نسخۂ پٹنہ) میں رقمطراز ہے کہ بتاریخ ۲۹ ذیحجہ سنہ ۱۱۸۰ھ وارد اورنگ آباد ہوئے، اور میں نے ان سے ملاقات کی۔ آئندہ سال کی ۶ محرم کو وہ عازم سورت ہوئے اور اواخر سنہ ۱۱۸۳ھ میں "عتبات عالیات" کی زیارت (حج کا ذکر شفیق کے یہاں نہیں) کے بعد ہندوستان واپس آرہے تھے کہ ان کی کشتی ڈوب گئی۔ آزاد بلگرامی کی تاریخ بھی اس کتاب میں ہے: "کو آہ فقیر میر شمس الدین ہائے"

سرب سنگھ دیوانہ دہلوی کو حسن نے معاصرین سودا و میر و درد میں محسوب کیا ہے، میرا قیاس ہے کہ ان کی ولادت سنہ ۱۱۴۰ھ کے لگ بھگ ہوئی۔ ڈاکٹر سید عبداللہ نے لکھا ہے کہ "عام رائے یہ ہے کہ سنہ ۱۲۱۴ھ میں .. چل بسا" لیکن یہ بات ان کی کتاب "ادبیات فارسی میں ہندوؤں کا حصہ" کے سوا میں نے

۱۔ اشاعت اکی ترتیب شبلی نے کی اور اس کا مقدمہ ڈاکٹر عبدالحق نے لکھا۔
۲۔ مرتبہ ڈاکٹر زور ۳۔ اشپرنگر نے لطف کے علاوہ علی ابراہیم خاں خلیل کے تذکرے کا بھی حوالہ دیا ہے، مگر ان دونوں میں یہ سنہ نہیں ۴۔ شیفتہ نے حوالہ نہیں دیا، لیکن یہ معلوم ہے کہ گلشن ہند ان کے مآخذ میں ہے۔

کہیں اور نہیں دیکھی۔ اشپرنگر نے بحوالہ شیفتہ ۱۲۰۶ھ سال وفات بتایا ہے
(قاموس المشاہیر میں بھی یہی سنہ) لیکن گلشن بیخار کے کل خطی اور مطبوعہ نسخے
جو میری نظر سے گزرے ہیں، سنہ انتقال سے خالی ہیں۔ لطف کا بیان ہے کہ
۱۲۰۴ھ میں صحرائے عدم کو سدھارے، اور یہ حقیقت سے نسبتہً قریب ہے۔
صحیح تاریخ وفات ۱۹ رمضان (روز چہارشنبہ) ۱۲۰۳ھ ہے جو بھگوانداس
ہندی کے سفینۂ ہندی (نسخۂ پٹنہ) سے معلوم ہوتی ہے۔ ہندی کے دیوانہ سے
گہرے تعلقات تھے، مرض الموت میں دیوانہ نے ہندی سے کہا تھا کہ میرے
لوح گیہ کی فکر کرنا۔ اس کے قطعۂ تاریخ کے دو شعر یہ ہیں:

بچار شنبہ ماہ صیام نوزدہم ۔ برفت رائے سرب سکھ سوئے بہشت بریں
"بہشت یافتہ" تاریخ رحلتش باشد ۔ دلیل مغفرت او ہمیں بود بہ یقیں

شادمان بہاری یکے از مشائخ، وفات دہلی ۱۱۲۹ھ (تاریخ محمدی
مصنفہ مرزا محمد حارثی، نسخۂ کتبخانۂ رضائیہ رامپور = ح)

شاکر تخلص، سید محمد بلگرامی تبصرۃ الناظرین (نسخۂ پٹنہ) میں لکھتے ہیں کہ میں
منگل کے دن عصر سے قبل، ۱۱۰۱ھ کی ۱۴ ربیع الاول کو متولد ہوا۔ مہینے اور سنہ
کی تصدیق آزاد بلگرامی (خواہرزادۂ شاعر) کی سرو آزاد (= سرو) سے بھی ہوتی ہے۔
وفات نشتر عشق (مصنفۂ عاشقی، نسخۂ پٹنہ = نشتر) کے مطابق بلگرام میں بتاریخ
۲۸ شعبان ۱۱۸۵ھ واقع ہوئی، لیکن تذکرۂ علمائے ہند (مصنفہ رحمٰن علی = تع)
میں ۸ شعبان، شب شنبہ ۱۱۸۵ھ۔ اس معاملے میں آزاد کے شاگرد، شفیق کی
شہادت بڑی اہمیت رکھتی ہے، اس کا بیان وہی ہے جو صاحب تع کا ہے۔

گل رعنا میں آزاد کی تاریخ بھی ہے: "رفت قدسی زماں سید محمد از جہاں"

مرزا احمد، منشا، داماد انشا سنہ ۱۲۱۰ھ کے لگ بھگ پیدا ہوئے ہوں گے۔ عبرتی ریاض الافکار (نسخۂ پٹنہ = ریاض) میں لکھتے ہیں کہ پٹنہ میں بعمر "چہل و چند" بتاریخ ۲۳ ربیع الثانی سنہ ۱۲۵۵ھ فوت ہوئے اور مدفن مقبرۂ شاہ ارزاں ہوا۔ دیوان یاس شاگرد راسخ (مطبوعہ) میں حسب ذیل تاریخ درج ہے: "آرمید احمد منشا بمیاں جنت"

طالب علی، طالب برادر خورد راسخ و شاگرد فدوی نے آغاز جوانی میں وفات پائی سادہ تاریخ از عشقی "طالب علی در قرب احمد یافت جا" = ۱۲۱۷ (تذکرۂ عشقی نسخۂ راقم)

میر شمس الدین، مخاطب بہ میر علی خاں جواہر رقم، پسر سید علی خاں جواہر رقم، عمر متجاوز از ۶۰، وفات دہلی سنہ ۱۱۴۳ھ ح۔

خواجہ معتصم برادر کلاں صمصام الدولہ خاندوران وفات دہلی، ۲۱ شوال سنہ ۱۱۵۳ھ ح۔

رائے نوندھ کھتری پیشکار نن، عمر "ہفتاد و چند" وفات دہلی، جمادی الاولی سنہ ۱۱۵۲ھ ح۔

خواجہ محمد موسیٰ مخاطب بہ سربلند خاں ابن خواجہ یعقوب (مخاطب بہ سربلند خاں) و داماد جہاندار شاہ، عمر قریب ۷۰، وفات دہلی ۳ جمادی الاولی سنہ ۱۱۵۲ھ ح

خواجہ عیسیٰ پسر خواجہ موسیٰ و عفت آرا بیگم، دختر جہاندار شاہ، قلعۂ دہلی میں قید تھے (عمر "عشرۂ خامسہ") در سلخ شوال" کو سنہ ۱۱۵۵ھ میں فوت ہوئے ح۔

خواجہ عبدالرحیم نقشبندی متخلص بہ عابد، وفات دہلی شب شنبہ ۶ ذیقعدہ ۱۱۲۵ھ ح۔

محمد ابراہیم مخاطب بہ مرحمت خاں ہفت ہزاری، پسر امیر خاں نے زمانۂ صوبہ داری بہار میں بعمر ۴۵ سال بمقام پٹنہ بتاریخ ۴ محرم ۱۱۳۸ھ وفات پائی ح۔

عمدۃ الملک، امیر خاں، انجام جن کا اصلی نام محمد اسحاق اور مختلف اوقات میں کامیاب خاں اور عزیز اللہ خاں خطاب رہے تھے "اندرون جلوخانۂ دیوان خاص" بروز جمعہ، تاریخ ۲۳ ذی الحجہ ۱۱۵۹ھ اپنے ایک نوکر کے ہاتھ سے قتل ہوئے" عمر ۵۹ سال (ح)۔ سیر المتاخرین میں بھی یہی تاریخ ہے۔ مادۂ تاریخ ماخوذ از دیوان تاباں:۔ "مارا ہے امیر خاں" ص ۲۷۳

میر احمد خاں" از امرائے شاہ عالمی و صوبہ داری برہان پور درمعرکۂ کفار شہادت یافت' دہم صفر' سہ ہزاری" ۱۱۲۱ھ (ح) یہ درد کی والدہ کے دادا تھے (میخانۂ درد) حارثی نے ان کے بیٹے کے حال میں ضمناً سال وفات ۱۱۳۲ھ لکھا ہے۔

خواجہ محمد علی، تمنا عظیم آبادی کا ذکر ریختہ گو کی حیثیت سے گلزار ابراہیم میں ہے۔ نشتر عشق میں سال وفات ۱۲۳۲ھ لکھا ہے اور اندرمن کی تاریخ بھی اس میں ہے۔

"لیاقت و سخن و امتیاز و علم و عمل شدند بے سر و پا در غم تمنا ہائے"

شیخ جان محمد دہلوی رسّال پدر رحیم النسا کو کہ (جسے چند سال عہد محمد شاہ میں بڑا اقتدار حاصل رہا تھا) کی وفات شب ۲۸ رجب ۱۱۵۱ھ میں ہوئی۔ ح

زن شیخ جان محمد رسال و والدۂ رحیم النسا و علی حامد خاں وغیرہ وفات دہلی ۱۱۵۵ھ ح۔

سید محمد حسین محزون اورنگ آباد میں پیدا ہوئے اور ۴۰ (مسرت) یا ۴۱ (شورش) برس کی عمر میں بمقام الہ آباد بتاریخ ۱۹ ذیحجہ ۱۱۸۵ھ فوت ہوئے (مسرت وشورش)، مادۂ تاریخ از شاہ اجمل الہ آبادی: "وائے غم حسین" (مسرت)

غلام قطب الدین مصیب الہ آبادی ولادت غرہ محرم ۱۱۳۸ھ تاریخ: "نیکبجت ازلی بادا" (تع)، عمر ۵۰ سال (مسرت)، وفات مکہ سلخ ذیقعدہ (مسرت و تع لیکن شورش غرۂ ذیحجہ)، ۱۱۸۷ھ (ہر سہ) تاریخ از اجمل: "قطب زماں وفات یافت" از جگل کشور، شاگرد مصیب: "قطب الدین ("قطب دین" چاہیے) زین جہاں افسوس" تع۔

شیخ محمد فاخر، متخلص بہ زائر الہ آبادی تاریخ ولادت: خورشید = ۱۱۲۰، وفات یکشنبہ وقت اشراق، ۱۱ ذیحجہ ۱۱۶۴ھ بمقام برہان پور، تاریخ: "زوال خورشید") سرو

داراب بیگ، جویا وفات کشمیر ۱۱۱۸ھ (ح) ان کے شاگرد قبول کی تاریخ "سخن پرور" (ہمیشہ بہار)

ہدایت اللہ زریں رقم "خوشنویس مشہور" وفات احمد نگر ۱۱۱۸ھ (ح)

ایزد بخش، رسا اکبر آبادی ۱۱۱۹ھ میں زہر کھا کر مرے، تاریخ از حاتم بیگ: "رسا رفتہ از جہاں بجناں" (سفینۂ خوشگو جلد ۳ نسخۂ پٹنہ)، عارفی نے لکھا ہے کہ موت اکبر آباد میں ۱۹ میں ہوئی مگر آخر میں اضافہ کیا ہے: "رسالۂ سید نصرت اللہ احراری فی السنۃ الماضیہ" صحیح ۱۱۱۹ھ ہی ہے۔

منتظر، شاگرد مصحفی کے سال وفات سے بحث کرتے ہوئے میں نے معاصرا

صنہ ۱۶ میں لکھا تھا کہ مصحفی کی ایک تاریخ میں "از سر افسوس" کی جگہ "از سر ہیہات" ہوتا تو ان کی دوسری تاریخ سے جو سنہ نکلتا ہے اس سے مطابقت ہو جاتی۔ مصحفی کے دیوان فارسی (نسخہ سنٹرل کالج کلکتہ) میں بھی "سر افسوس" ہی نکلا، لیکن اس میں تیسری تاریخ بھی ہے جس کی طرف میں نے معاصر میں اشارہ کیا تھا اور یہ سنہ ۱۲۱۷ھ پر مشعر ہے: "شاعر شیریں زباں ہائے" اس سنہ کی صحت میں اب شک نہیں رہا۔

میر وارث علی، نالاں عظیم آبادی شاگرد فغاں کی وفات کی تاریخ: "میر وارث علی نالاں" = ۱۱۹۹ (دیوان جوشش عظیم آبادی)

سیالکوٹی مل، وارستہ کا سال ولادت نامعلوم، لیکن قیاس ہے کہ سنہ ۱۱۱۰ھ اور سنہ ۱۱۱۵ھ کے درمیان پیدا ہوئے ہوں گے۔ ان کی مصطلحات شعرا (مصطلحات الشعرا غلط) کا سال آغاز سنہ ۱۱۴۹ھ ہے۔ ڈاکٹر منوہر سہائے انور نے گل رعنا نسخہ لاہور کے حوالے سے سال وفات سنہ ۱۱۸۲ھ لکھا ہے (معاصر ا صہ ۴۵) لیکن اس کے نسخہ پٹنہ میں سنہ ۱۱۸۰ھ ہے۔ میں نے اس کے متعلق استفسار کیا تو جناب انور نے اقرار کیا کہ یہی صحیح ہے سنہ ۱۱۸۲ھ سہو قلم ہے۔

راجہ روشن رائے کبوہ "از امرائے عصر" وفات دہلی، محرم یا صفر سنہ ۱۱۵۹ھ (ح)، لیکن دیوان تاباں میں یہ تاریخ:

"یوں کہا دل نے خدا کے حکم سے آگ روشن رائے پر ہوئی لالہ زار" صہ ۲۷۲

مصرع آخر کے نیچے سنہ ۱۱۵۳ھ مرقوم ہے، لیکن اس سے ۱۲۸۵ نکلتا ہے اور "خدا کے حکم سے" جزو تاریخ سمجھا جائے تو ۲۰۵۸ مستخرج ہوتا ہے۔ ۱۱۵۳ کسی طرح برآمد نہیں ہوتا، خبر نہیں غلطی نسخے میں یہ ہے یا مرتب ڈاکٹر عبد الغنی کا اضافہ ہے۔

آقا مومن مخاطب بہ مومن خاں "احمد الاعیان" (ح) پدر جعفر علی خاں امیر علی (جو یقین ہے کہ زکی ہیں) کا نام حسن نے مومن بیگ لکھا ہے۔ وفات دہلی، شوال ۱۱۵۵ھ ح۔

شیخ اسد اللہ مخاطب بہ اسد الدولہ اسد یار خاں (متخلص بہ انساں) "از کبار امرائے عصر" کی وفات دہلی میں بعمر "پنجاہ و چند" اواسط ربیع الاول ۱۱۵۸ھ میں واقع ہوئی (ح)، سیر المتاخرین میں نصف آخر ربیع الاول ۵۸ھ ہے اور یہ بھی ہے کہ نعش اکبر آباد گئی۔

میر محمد علیم، تحقیق عظیم آبادی شاگرد مخبر فطرت عمر ۹۰ سے متجاوز خوشگو (عمر قریب بصد صحف ابراہیم نسخہ پٹنہ) وفات ۱۱۶۲ھ (خوشگو و صحف) بمقام پٹنہ، تاریخ از الفت: "تحقیق شدہ واصل حق" (خوشگو)

محمد علی، الفت اصفہانی وارد مرشد آباد عہد وردی خاں وفات ۱۱۸۶ھ (صحف)

ولی اللہ ابن حبیب اللہ ابن محب اللہ از علمائے فرنگی محل وفات ۱۰ صفر ۱۲۷۰ھ تاریخ از جواد فتح پوری:

کز وفا نقش شد ندیے سر و پا ورع و شرع و فضل و علم و کمال (نغ)

منشی خیالی رام، خیالی، شاگرد ممتاز وفات بعمر ۷۰ سال، ۱۲۸۹ھ (صبح گلشن)

مالحہ بانو مشہور بہ بیگمی، منقربہ محمد شاہ، وفات دہلی محرم ۱۱۴۹ھ ح۔

فتح پوری محل، منکوحہ محمد شاہ وفات دہلی، شب پنجشنبہ ۸ ربیع الثانی ۱۱۳۷ھ ح۔

میر باقی خوسنئی (پدر ولایت اللہ خاں و حشمت) عمر تخمیناً ۷۰، وفات اواخر

جمادی الاولی یا اوائل جمادی الثانی ۱۱۳۷ھ ح۔

سید محمد شوشتری مخاطب بہ صفدر محمد خاں، دیوان لاہور، وفات دہلی عشرۂ ثانی ذیقعدہ ۱۱۵۸ھ ح۔

سید لفر نیار خاں بارہہ، ہدایت اللہ، رکن الدولہ، ہفت ہزاری "موت تخیفاً" قریب شصت سال کی عمر میں بمقام دہلی، ۲۲ رمضان ۱۱۳۴ھ کی شب کو ہوئی (ح) کا ہور خاں کی تاریخ (نسخۂ پٹنہ) میں بھی یہی تاریخ، اور یہ لکھا ہے کہ نعش بارہہ گئی۔ اس تاریخ میں صوبہ داری عظیم آباد کا بھی ذکر۔

شیخ حسام الدین پدر آرزو وفات ۱۱۱۵ھ (خوشگو)

مرزا ابوطالب خاں نے اپنے تذکرے خلاصۃ الافکار میں اپنا مولد لکھنؤ اور سال ولادت ۱۱۶۶ھ لکھا ہے۔ بیل نے مفتاح التواریخ میں ۱۲۲۰ھ سال وفات لکھا ہے اور ایک قطعۂ تاریخ بھی درج کیا ہے جو اس نے مرزا کے بیٹے کی فرمایش پر کہا تھا۔ سنۂ وفات خود اسی سے معلوم ہوا ہوگا۔

شاہ فصیح متخلص بہ افصح شاگرد بیدل لکھنؤ چلے آئے تھے اور (ظاہراً وہیں) قریب بعد کی عمر میں ۱۱۹۲ میں وفات پائی (تذکرۂ میر حسن) عمر میں مبالغہ ہو تو عجب نہیں، باغ معانی (نسخۂ پٹنہ) میں غالباً ۱۱۴۷ھ میں عمر "متجاوز از ستین" لکھی ہے۔

اصالت خاں، ثابت عظیم آبادی شاگرد فدوی وفات ۱۲۰۸ھ (عشقی)

گل محمد خاں متخلص بہ شاعر مخاطب بہ مجتبیٰ یاب خاں، شاگرد بیدل، عمر "پنجاہ و چند" وفات دہلی، شعبان ۱۱۵۸ (ح)، مگر خوشگو و عاشقی ۱۱۵۷ھ۔

خواجہ امین عظیم آبادی جو شتی وغیرہ کے معاصر تھے، خمخانۂ جاوید جلد ۱ میں کسی سند کے بغیر لکھا ہے کہ ۱۸۴۲ء کے قریب تک زندہ تھے، بعض جواہر مرتبۂ کیفی چریاکوٹی و مصححۂ ڈاکٹر سید سلیمان ندوی میں ظاہراً اسی کی بنا پر مرقوم ہے کہ "۱۲۵۹ھ تک زندہ تھے" (ص ۳۹۴)، مگر یہ بے بنیاد محض ہے۔ ان کی وفات ۱۱۹۹ھ ہی میں ہو چکی تھی (بیاض محمد علی تمنا عظیم آبادی نسخۂ رقم)

سید جعفر رنبیر پوری متخلص بہ روحی وفات غرۂ رمضان ۱۱۵۲ھ، مدفن رنبیر پور، تاریخ از آزاد:

سال تاریخ او نشود پیدا وقت تکرار "جعفر روحی" (سرو)

میر علی حسن، اشک پسر ضیغم وفات حیدر آباد ۱۸۹۰ء (واقعات انیس ص ۲۵)

عبد الغنی قبول، کشمیری وفات ۱۱۳۹ھ تاریخ: "گنج معنی بود کرد افلاک رازیر زمیں" (سرو)، لیکن سفینۂ خوشگو میں ۱۱۳۷ھ ہے۔

محمد مستعد خاں، نام اصلی شیخ محمد بقاہ، عہد احمد شاہ میں قاضی جونپور وفات ۱۱۸۴ھ (تذکرۃ العلما مصنفۂ خیر الدین محمد ص ۵۹)

میر محمد قاسم مخاطب بہ مبشر خاں، منجم بہادر شاہی وفات دہلی، رمضان ۱۱۳۷ھ۔

میر حسن علی، برادر عمزاد و جانشین محمد عسکری جونپوری وفات ۱۲۱۶ھ (خیر الدین محمد ص ۶۰)

میرزا قتیل، خطبۂ دیوان قتیل کی عبارت ہے: "اکنوں کہ تماشائے عمر مستعار از بہارستان عشرۂ رابع فارغ و قدم در چمن اول از خامس اعتبار گذاشتہ ودوی در سنہ

احدی عشر و مأتان و الف از ہجرت.. و سال بیست و نہم از جلوس حضرت ظل اللہی است" (ثمرات البدائع صفحہ ۱۷) "بیست و نہم" چھاپے کی غلطی یا خود قتیل صاحب کا سہو قلم ہے، اس کی جگہ "سی و نہم" چاہیے۔ شاہ عالم ثانی کی تاریخ جلوس ۲ جمادی الاولی ۱۱۷۳ھ ہے اور ۱۲۱۱ھ اڑتیسویں اور انچالیسویں سال جلوس کے مطابق پڑتا ہے۔ عبارت منقولہ لازماً یکم جمادی الاولی ۱۲۱۱ھ کے بعد اور یکم محرم ۱۲۱۲ھ سے پیشتر سپرد قلم ہوئی ہے۔ غالباً اس سے بھی کسی کو اختلاف نہ ہوگا کہ قتیل کے فحوائے کلام سے مترشح ہوتا ہے کہ تحریر کے وقت انہیں اپنی عمر کے اکتالیسویں سال میں قدم رکھے ہوئے زیادہ دن نہیں گزرے تھے۔ یہ امور پیش نظر رہیں تو سال ولادت ۱۱۷۱ھ قرار پاتا ہے، لیکن، عاشقی نے جو قتیل سے ذاتی تعلقات رکھتے تھے نشتر میں اور زخمی نے جو باشندۂ لکھنؤ اور شاگرد قتیل تھے انیس العاشقین (نسخۂ لکھنؤ) میں ۱۱۷۲ھ لکھا ہے۔ اگر ان دونوں کو سال پیدائش سے متعلق اطلاع خود قتیل سے ملی تھی، اور یہ قرین قیاس ہے تو قول آخر بہ بلسے صراحت قابل ترجیح ہے۔ عبرتی نے ریاض میں عمر شصت و چند لکھی ہے، اس کا اعتبار نہیں۔ عاشقی کا بیان ہے کہ وفات سنیچر کے دن وقت سحر، بتاریخ ۲۳ ربیع الاول ۱۲۳۳ھ واقع ہوئی اور زخمی بھی یہی کہتے ہیں مگر انھوں نے وقت نہیں بتایا۔ عسکری بلگرامی نے صحائف شرائف (نسخۂ پٹنہ) اور عبرتی عظیم آبادی (ریاض الافکار) نے بھی یہی سنہ لکھا ہے اور متعدد تاریخیں اس کے ثبوت میں پیش کی جاسکتی ہیں، از آنجملہ: "آہ گل رفتہ بہمراہ نسیمے بوباں" (مجموعۂ اشعار فارسی کتبخانۂ دانشگاہ ڈھاکہ) عاشقی: "فیضی دو بھیا برد لے آہ" (نشتر)

عسکری: "مردہ آہ عیسیٰ زمانِ سخن" (بہ اضافہ ۲۰ بموجب ہدایت مصنف 'صحائف) امامی شاگرد قتیل: "داد نورے بہزار و بجہان تاریکی" (صحائف) ایضاً: "ہزار و دو و سی و سہ ہجری بشمار (صوری و معنوی، صبح گلشن)، صاحب راے ناتخ گو: "شد کتاب عجیب دریا برد" (بیل)، نصرت شاگرد قتیل: "آہ صد حیف از وفات قتیل" (صبح گلشن) صاحب عالم بلگرامی کی بیت ذیل صحائف میں ہے:

براے ماتم او گشتہ اند بے سروپا لطیفہ و سخن و شعر و نکتہ رمز و ادا

مگر اس سے ۱۲۳۳ اسی صورت میں نکل سکتا ہے کہ لفظ "ماتم" کے ہر دو میم کا ۸۰ ان اعداد پر جو مصنف کی ہدایت کے بموجب شعر سے مستخرج ہوتے ہیں، اضافہ کیا جائے اور شاعر یہ بات کہنے سے قاصر ہا ہے۔ بیل نے صاحب راے کی ایک اور تاریخ دی ہے اور یہ بھی سنہ ۱۲۳۳ھ پر مشتمل ہے، لیکن اسے حافظ بخش محمد ساکن قصبۂ دیوا (از مضافات لکھنؤ) کی ایک تاریخ ملی ہے جس سے ۱۲۳۳ نکلتا ہے:

خود آں کافر بگفتا از سر کفر قتیل کافر ایمانے ندارد

مصرع آخر خود قتیل کا ہے اس کے اعداد پر کاف کفر کے ۲۰ کا اضافہ ہو، تو ۱۲۳۲ ہو جاتا ہے۔ اس کی وجہ سے بیل خود تو شبہے میں پڑ گیا ہے، لیکن اس کے پیرو، صاحب قاموس المشاہیر نے صرف یہی سنہ لکھا ہے، اور نواب صدیق حسن خاں نے شمع انجمن نے نہ معلوم کس طرح سنہ ۱۲۴۲ھ لکھ دیا ہے۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ صحیح سال وفات سنہ ۱۲۳۳ھ ہے۔

میر سید محمد بن میرا حمد خان بہادر، اندجانی الاصل، صوفی و زاہد، عمر ۸۰

سال ۵ ماہ، وفات دہلی، "یوم الاثنین ثانی جمادی الثانی بحساب التقویم" (ح کی نقل پیش نظر)۔ یہ درد کے نانا تھے۔

قمرالدین، منت دہلوی کی نسبت عاشقی کا قول ہے کہ انہوں نے ۴۹ سال کی عمر پائی (نشتر)، اس حساب سے زمانہ ولادت ۱۱۵۹ھ کے لگ بھگ ٹھہرتا ہے، لیکن یہ صحیح نہیں، علی ابراہیم خاں، خلیل نے خلاصۃ الکلام (نسخہ پٹنہ) میں منت کا احوال خود منت سے معلوم کرکے لکھا ہے اور اس تذکرے میں سال ولادت ۱۱۵۶ھ مرقوم ہے۔ جناب عرشی نے منت کا جو ترجمہ حواشی دستور الفصاحت میں نشتر سے نقل کیا ہے، اس میں یہ تاریخ وفات شامل ہے: "قمردین بخسوف آمد آہ" اور ان کے قول کے مطابق اس سے ۱۲۰۸ نکلتا ہے، لیکن یہ اس صورت میں ہوسکتا ہے کہ "آمد" کے بعد "ہ" کا اضافہ کیا جائے اور نشتر نسخہ پٹنہ میں اسی طرح ہے۔ جناب عرشی نے دیوان ذاری، شاگرد منت سے ایک تاریخ پیش کی ہے جو سنہ مذکور کی مؤید ہے اور احسان اللہ، ممتاز کا نکالا ہوا مادہ "غروب" (بدول حوالہ کتاب) دیا ہے۔ اس سنہ کا سب سے قوی ثبوت ممنون، پسر منت کی تاریخ ہے: "حیف منت ہائے ہائے" (دیوان ممنون نسخہ ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ)۔ سال وفات کے متعلق اور اقوال بھی ہیں، مصحفی: "منت کجا وزمزمۂ شاعری او" ۱۲۰۷ (تذکرۂ ہندی)، عبدالواسع از فضلائے لکھنو: "حیف قمرالدین منت ہائے ہائے" ۱۲۰۷ (نشتر)، گلشن ہند مصنفہ لطف: "سنہ ۱۲۰۶ میں .. کلکتہ .. آئے ایک تین چار روز تب محرق .. عارض ہوئی اور بغیر جان لیے .. نہ گئی، چنانچہ کلکتہ مدفون ہوا"

غلام حسین، شورش عظیم آبادی میر باقر، حزیں کے شاگرد تھے۔ جو تذکرہ گردیزی
کے اتمام سے قبل وفات پا چکے تھے۔ اس سے ان کے زمانۂ ولادت کا کسی حد تک
اندازہ ہو سکتا ہے۔ سال وفات بقول شیفتہ سنہ ۱۱۹۰ھ ہے، لیکن مسرت افزا میں
ہے کہ شعبان سنہ ۱۱۹۵ھ کے پہلے عشرے میں ان کا انتقال ہوا۔ یہی سنہ گلزار ابراہیم
میں بھی ہے۔ شورش نے اپنے تذکرے کی تاریخ "یادگار دوستان روزگار" (=۱۱۹۱)
لکھی تھی (مسرت) شیفتہ کا قول غلط ہے اور سنہ ۱۱۹۵ھ صحیح ہے۔

شیخ محمد سعید، اعجاز اکبر آبادی وفات سنہ ۱۱۱۷ھ جیسا کہ حارثی نے اعجاز کے
بیٹے سے سنا تھا۔ ح میں رسالۂ نصرت اللہ احراری کا حوالہ بھی ہے۔

شیخ سعد الدین بن عبد العزیز سرنت عمر ۵۰، وفات لاہور سنہ ۱۱۱۸ (ح
بحوالۂ رسالۂ احراری)

محب اللہ بن نور اللہ بن نور الحق بن شیخ عبد الحق دہلوی وفات سنہ ۱۱۲۰ (ح)

محمد بیگ مخاطب بہ مخلص خاں بہادر بن احمد بیگ حارثی "از کبار امراے
شاہ عالمی "پنجہزاری" "نیمروز سہ شنبہ ۲۱ صفر سنہ ۱۱۲۲ بحکم جہاندار شاہ کشتہ شد"
عمر ۵۲، یہ حارثی کے والد کے "ابن عم" تھے (ح)

شیخ قدرت اللہ بن شیخ عبد الجلیل اکبر آبادی "از علماے متصوفہ شب شنبہ ۱۳
ذی قعدہ بفرمان بادشاہ (فرخ سیر) بخفہ کشتہ شد" (ح)

آقا ابراہیم متخلص بہ راجی ثم بہ فیضان پسر آقا محمد حسین، ناجی وفات دہلی،
صفر سنہ ۱۱۲۸ (ح)

شیخ ابو المعانی، خوش نویس نستعلیق وفات دہلی سنہ ۱۱۲۹ (ح)

معاصر

حکیم محمد ہادی، مخاطب بہ بقراط خاں وفات دہلی ذیقعدہ سنہ ۱۱۲۹ ح

حکیم شریف خاں دہلوی وفات سنہ ۱۲۳۱ تاریخ: "صد افسوس مرزا محمد شریف" تغ

حافظ امان اللہ بنارسی "جامع المعقول والمنقول" وفات بنارس سنہ ۱۱۳۳ ح

حسب ذیل اشخاص نادر شاہ کے خلاف صمصام الدولہ کی ہمراہی میں لڑتے ہوئے بتاریخ ۱۵ ذیقعدہ سنہ ۱۱۵۱ھ مقتول ہوئے:

(۱) علی اسد خاں معروف بہ میر کلو "از کبار امرائے ہند" (۲) علی حامد خاں بن شیخ جان محمد رمال "از کبار امرائے ہند" عمر چہل وچند" (۳) عاقل بیگ خاں کمل پوش بن ولی بیگ کمل پوش "از امرائے ہند" عمر در عشرۂ سابعہ (۴) احترام خاں بن صمصام الدولہ عمر بیست وچند (۵) شہداد خاں خویشگی "از کبار امرائے ہند" عمر عشرۂ سابعہ (۶) امیر بیگ مخاطب بہ یادگار خاں بن ضیا بیگ بلوچ "از امرائے ہند" عمر قریب ۶۰ (۷) اصلح علی خاں خواجہ سرائے ثابت خانی از امرائے ہند (۸) رتن رائے بن رائے خوش حال چند کایتھ ماتھر "احد الاعیاں" (۹) عاقل بیگ بخشی مظفر خاں (ح)

حسب ذیل اشخاص قتل عام نادری میں بتاریخ ۱۱ ذیحجہ سنہ ۱۱۵۱ھ مقتول ہوئے:

(۱) خوش حال رائے اکبر آبادی طبیب حاذق عمر ۷۰ (۲) ثابت قدم خاں خویشگی "احد الاعیان" در عشرۂ سادسہ (۳) عبد الرحیم خاں مخاطب بہ رحیم داد خاں "احد الاعیان" عمر پنجاہ وچند (۴) قاسم حسین خاں بن قاسم حسین خلف بن میر کلاں "احد الاعیان" (۵) جمال اللہ خاں قول "احد الاعیان" عمر تخمیناً ۶۰ (۶) میر مبارک خاں

بن میر امام امام الدین خاں خوسنی "احد الاعیان" عمر قریب ۵۰، (۷) سعید نبی خاں پوربی "احد الاعیان" (۸) بوعلی خاں بن بوعلی خاں شیرازی "احد الاعیان" (۹) مقرب خاں بن تقرب خاں شیرازی از امرائے ہند (۱۰) شیخ محمد عابد علوی لاہوری خوش نویس نستعلیق (ح)

میر حبیب اللہ خاں مخاطب بغیرت خاں بہادر صلابت جنگ بن میرک خاں نعمت اللہی عمر متجاوز از ۵۰، وفات ۲۵ یا ۲۶ رمضان ۱۱۶۰ھ (ح) سفینۂ ہندی میں ہے کہ وفات محمد شاہ سے چند ماہ قبل وفات پائی۔ یہ شیر افگن خاں باسطی صاحب بیاض باسطی کے والد تھے۔ اگر مصحفی نے عمر باسطی کے باب جو کچھ لکھا ہے صحیح ہے تو غیرت خاں کی عمر ۶۰ سے بھی متجاوز ہوگی۔

میر محمد قائم خوش دل دہلوی وفات ۱۵ رجب ۱۱۶۶ھ (ملحقات ح)

ماہر نرائن کھتری "فقیر متصوف طالب علم" اسی سال (۱۱۵۵ھ) یا سال گذشتہ وفات (ح)

علی اصغر المخاطب بہ علی اصغر خاں ثم بہ خانزماں بہادر بن کار طلب خاں انصاری میواتی "از کبار امرائے عصر" عمر ۷۰ سے کچھ کم یا زیادہ وفات دہلی ۲ ذی الحجہ ۱۱۵۵ھ (ح)

اسمٰعیل علی خاں بن علی رضا مخاطب بہ غلام علی خاں "احد الاعیان" وفات دہلی صفر ۱۱۵۵ھ۔ یہ موتمن الدولہ محمد اسحٰق خاں کے برادر کلاں تھے ح۔

سید حکمت خاں طبیب ماہر وفات اواخر رجب ۱۱۵۵ھ، دہلی عمر در عشرہ سابعہ (ح)

ملا احمد خاں کوکہ بن شیخ جان محمد رمال "از کبار امرائے عصر" عمر متجاوز از ۵۰

وفات دہلی ۲۸ محرم سنہ ۱۱۵۶ھ ح
مستقیم خاں بن مظفر خاں و برادر زادۂ صمصام الدولہ "از امرائے عمر" وفات
دہلی، شوال سنہ ۱۱۵۷ھ ح
راجہ آتمارام کھتری دیوان صفدر جنگ وفات ذیحجہ سنہ ۱۱۵۸ھ ح
خواجہ صدر الدین مخاطب بہ کوکلتاش خاں بہادر "از امرائے عمر" وکوکہ محمد شاہ
عمر متجاوز از شصت وفات دہلی، ۸ ربیع الثانی سنہ ۱۱۵۹ھ ح۔
سید محمد خاں بغدادی "احد الامرا" نائب عمدۃ الملک در صوبۂ الہ آباد
از آنجا تغیر شدہ بحضور مے آمد، در راہ بموضع خرجہ فوت شد ذیقعدہ سنہ ۱۱۵۹ھ ح
حاجی ظریف خاں "احد العلما و الاعیان" استاد وزیر الممالک قمر الدین
خاں وفات دہلی، ۲۲ شعبان سنہ ۱۱۵۹ھ ح
عبد الستار خاں سمرقندی "از امرائے عمر" برادر خرد عبد الوہاب بیگ
خاں عمر قریب ۸۰، وفات دہلی، شعبان سنہ ۱۱۶۰ھ ح
حکیم علی اکبر خاں شیرازی طبیب حاذق وفات دہلی شوال سنہ ۱۱۶۰ھ ح
سید غلام علی خاں بارہہ "از امرائے عمر" نائب صوبۂ الہ آباد تھے کہ بتاریخ
۵ ذی الحجہ سنہ ۱۱۶۰ھ فوت ہوئے ح
محمد نقی بہاری قادری عمر ہفتاد و چند وفات دہلی اواسط سنہ ۱۱۵۲ھ ح
خواجہ محمد عاصم مخاطب بہ اشرف خاں ثم بہ صمصام الدولہ امیر الامرا خان دوراں
بہادر منصور جنگ نادر شاہ کی لڑائی میں بتاریخ ۱۵ ذی القعدہ سنہ ۱۱۵۱ھ زخمی ہوئے
اور اسی کی وجہ سے ۱۹ ذیحجہ کو وفات پائی۔ عمر ۶۸ سال (ح)

والدۂ امیر خاں انجام وفات دہلی ۲۹ جمادی الآخری سنہ ۱۱۵۱ھ

سیدی بدیع الزماں مخاطب بہ فولاد خاں بن سید یحییٰ بن سیدی فولاد خاں حبشی "احد الاعیان" وفات دہلی شعبان سنہ ۱۱۵۱ھ

آبرو کا سال ولادت کسی نے نہیں لکھا، لیکن مصحفی نے یہ بتایا ہے کہ موت کے وقت عمر ۵۰ سے متجاوز تھی (تذکرۂ ہندی) اس حساب سے زمانۂ پیدائش سنہ ۱۰۹۵ھ کے لگ بھگ ٹھہرتا ہے۔ اس کی تردید کی کوئی شکل نظر نہیں آتی، لیکن، اس کے قبول کرنے سے یہ تسلیم کرنا لازم آتا ہے کہ یہ اپنے استاد آرزو (ولادت سنہ ۱۰۹۹ھ) سے کئی سال بڑے تھے۔ اس سلسلے میں یہ بات بھی نظر انداز کرنے کے قابل نہیں کہ مصحفی جو اپنا ماٰخذ نہیں بتاتے آبرو کی رحلت کے کم از کم ۱۵ برس قبل پیدا ہوئے ہیں اور کم از کم ۲۵ برس کی عمر میں دہلی پہنچے ہیں۔ مصحفی کے قول کی صحت متیقن نہیں۔ عہد شاہ عالم تک جو شعرائے ریختہ کے تذکرے لکھے گئے ہیں، ان میں آبرو کا سال وفات مندرج نہیں، لیکن اشپرنگر نے ظاہراً محض اس بنا پر کہ لطف کے نزدیک یہ عہد محمد شاہ میں فوت ہوئے ہیں، یہ لکھ دیا ہے کہ آبرو سنہ ۱۱۶۱ھ سے قبل مرے تھے۔ یہ غلط نہیں، مگر جن ماٰخذ سے اس نے کام لیا ہے (میر و قائم و گردیزی و لطف کے تذکرے) ان کی بنا پر یہ کہنے کا مجاز نہ تھا اس لیے کہ محمد شاہ کی وفات سنہ ۱۱۶۱ھ میں ۲۷ ربیع الثانی کو ہوئی ہے (ح و تاریخ مظفری وغیرہ)۔ وناسی نے تو تقلید اشپرنگر پر قناعت کی ہے، لیکن بیل نے اپنے بایوگرفیکل ڈکشنری میں سنہ ۱۱۶۱ھ ہی کو سال وفات قرار دیا ہے، اور بعد کے مصنفین کے لیے یہ سند ہو گئی ہے، چنانچہ ڈاکٹر سکسینہ اور بیل کی انگریزی تاریخ

ادب اردو قاموس المشاہیر جلد ا اور ”دو نایاب زمانہ بیاض اور ان کا انتخاب“
(شائع کردۂ ہندستانی اکیڈمی) کے حاشیے (ص ۲۲) میں یہی سنہ مرقوم ہے۔
یہ امر بھی قابل ذکر ہے کہ بعض نے اس کی فکر بھی نہیں کی کہ سنہ عیسوی سنہ ۱۱۶۱ھ
کے مطابق پڑتا ہے یا نہیں (مثلاً ڈاکٹر سکسینہ سنہ ۱۷۵۰ لکھتے ہیں۔) صحیح تاریخ
وفات ۲۴ رجب سنہ ۱۱۴۶ھ ہے جس کے متعلق میں نے ایک مختصر سا مضمون
معیار مارچ سنہ ۱۹۳۶ء میں شائع کیا تھا۔ یہ تاریخ سفینۂ خوشگو اور ح میں ہے
اور مقدم الذکر میں یہ بھی مرقوم ہے کہ آبرو کی قبر دہلی میں مزار سید حسن رسول نما
کے نزدیک ہے۔ خوش گو وحارتی کے قول کی صحت میں تامل روا نہیں۔ پہلا
آبرو کا دوست اور استاد بھائی ہے، اور دوسرا باشندۂ دہلی اور آبرو کا
ہمعصر ہے۔ بعد کے بعض فارسی تذکروں میں بھی یہ سنہ ہے (مثلاً گل رعنا اور
صحف) جہاں تک میرا علم ہے، اردو کا صرف ایک تذکرۂ شعرا ایسا ہے جس میں
(بہ تقلید شفیق) یہ سنہ دیا ہے۔ یہ خیراتی لعل 'بیجگر' کا تذکرہ ہے جو عہد اکبر ثانی
کی تصنیف اور جس کا واحد نسخہ لندن میں ہے۔ بیجگر نے تاریخ بھی کہی ہے:
”سخن را آبرو گو“ رامپور میں مجسّن، مصنف سراپا سخن کا لکھا ہوا ایک تذکرہ ہے
جس کے متعلق اس کا بیان ہے کہ یہ تذکرۂ قائم کا اردو ترجمہ ہے (اس میں
بکثرت ایسی باتیں ہیں جو قائم کے تذکرے کے مروجہ نسخوں میں نہیں ہیں)۔
اس تذکرے میں بھی ایک بیت ہے جس سے سنہ وفات نکلتا ہے۔ صاحب
تذکرہ نے یہ تو بتایا ہے کہ بیت بیدار کی ہے مگر یہ نہیں لکھا کہ یہ سنہ کیا ہے:

ہاتف از دیدہ آب ریختہ گفت　　آبرو بود آبروے سخن

بیدار غالباً سنائنۃ "بیدار تاریخ گو ہیں جن کا ذکر تذکرۂ حسن اور خلاصۃ الافکار میں ہے۔ مصرع آخر سے ۱۱۵۰ھ نکلتا ہے، اس میں سے "آب" کا ۳ خارج کیا جائے تو ۱۱۴۷ بچتا ہے۔ اس صورت میں بیدار اور خوشگو وحارثی میں اختلاف ہے، لیکن اس کا امکان ہے کہ بیدار نے آب کا ۳ لیا ہو، اس شکل میں اختلاف باقی نہیں رہتا۔

میرزا عتیق اللہ، نجات وفات غرۂ شوال ۱۱۷۵ھ، تاریخ شفیق:
"نجات یافتہ زیں بیوفا جہاں" (چمنستان شعرا)

سید احمد حسین متخلص بہ شکر و شاد شکوہ آبادی پدر منیر وفات ۱۲۵۰ھ
اشعار منیر از دیوان اول:

"شکر و شاد تخلص دونوں کندہ تھے یہ نقش نگیں میں..
کہتا ہوں تاریخ منیر اب گھر پایا ہے خلد بریں میں" ص ۲۹۹

سبحان علی خاں (کمبوہ یکے از امرائے لکھنؤ) دیوان منیر جلد ۱ میں قطعہ تاریخ وفات، "قبلۂ دہر ملاذ الحکما ہے ہائے" سے تاریخ نکالی ہے = ۱۲۶۴ھ ص ۳۱۵

نواب ذوالفقار علی خاں بہادر باندہ، دیوان منیر جلد ۲ میں تاریخ عیسوی وہجری درج ہے: "شد آہ ذوالفقار علی در نیام آہ" = ۱۸۴۹ع "بود مسند نشین خلد دائم" = ۱۲۶۵ھ ص ۲۳۶

حسین علی رزم فرخ آبادی، شاگرد منیر، تاریخ وفات: "بود حسین علی وارد زمین بہشت" = ۱۲۷۵ھ ص ۲۳۸

سید حسین مظہر برادر خرد منیر تاریخ وفات: "گلگشت ارم نگو نمودہ سید"
= ۱۲۶۶ دیوان منیر ۲ ص ۲۳۹

روشن الدولہ وزیر اودھ تاریخ وفات: "ہائے فخر الوزرا ہے ہے حیف"
سنہ ۱۲۶۹ھ دیوان منیر ۲ ص ۲۴۷

محمد عمر، خلف محمد اسمٰعیل تاریخ از مومن: "مرگ شیخ زماں" = سنہ ۱۲۶۸ھ (دیوان)

میاں کالے صاحب دہلوی کے متعلق بعض اصحاب کا خیال ہے کہ مومن کے بعد فوت ہوئے ہیں مگر قطعہ ذیل جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کی موت سنہ ۱۲۶۷ میں ہوئی تھی، دیوان مومن میں موجود ہے:

ہوئی جس دم وفات حضرت کی — مجھ کو تاریخ کا خیال آیا
ہاتف غیب نے کہا ناگاہ — کالے صاحب کو سرخرو پایا

مرزا مغل سبقت تاریخ وفات (۱۲۳۵) ماخوذ از دیوان ناسخ:

دلا مرزا مغل سبقت صد افسوس — ز دنیا سوئے جنت کرد رحلت
نوشتم سال تاریخ رحیلش — کہ مرد افسوس ہے افسوس سبقت

مرزا مغل بیگ کی وفات سے متعلق دو قطعے دیوان ناسخ میں، ایک کی ردیف "رستم وقت" ہے اور تاریخ: "اے وائے رستم وقت" سے نکالی ہے = ۱۲۳۴ دوسرے قطعے میں انھیں استاد کہا ہے اور مصرع تاریخ یہ نظم کیا ہے: "افسوس واویلا مرد استاد ہم افسوس" ناصر (خوش معرکۂ زیبا نسخۂ پٹنہ) کو دھوکا ہوا ہے کہ قطعۂ آخر مرزا مغل، سبقت سے سروکار رکھتا ہے۔

میر یعقوب، عیاش دیوان ناسخ مطبوعہ میں ایک قطعہ ہے جس کا عنوان

یہ ہے: "تاریخ وفات میر یعقوب عباس تخلص" قطعہ:

افسوس افسوس میر یعقوب افسوس   ازمردن خود مرا رسانید آلام
تاریخ وفات او نوشتم یارب   عباس بفردوس کند عیش مدام ۱۲۳۷

میر یعقوب، عباس کا ذکر کہیں اور نظر نہیں آتا، میرا قیاس ہے کہ "عباس" کی جگہ "عیاش" ہے اور میر یعقوب، عیاش کا ترجمہ تذکروں میں ملتا ہے۔ مصرع ثالث میں "یارب" کی جگہ "ناسخ" ہوگا اور مصرع رابع میں "عباس" کی جگہ "عیاش" اور "مدام" کی جگہ "دوام"۔ اس صورت سے ۱۲۳۸ مستخرج ہوگا۔ وہ اصحاب جن کے پاس دیوان کے معتبر قلمی نسخے ہوں توجہ فرمائیں۔

میر محمد ناصر، ساماں جونپوری شاگرد مظہر، لڑائی میں مقتول، وفات ۱۱۴۷ھ (خوشگو)

محمد مقیم، آزاد از اہل خطۂ مقیم اکبرآباد وفات ۱۱۵۰ھ (خوشگو)
سعد اللہ، اختر اجمیری وفات ۱۱۵۳ھ (خوشگو)

پیام اکبرآبادی کا ذکر آرزو نے مجمع النفائس (نسخہ پٹنہ) میں کچھ اس طرح کیا ہے کہ گویا پیام ان کے مستفیدوں میں ہیں، اس سے ان کے زمانہ ولادت کا کسی حد تک اندازہ ہو سکتا ہے۔ خوشگو نے لکھا ہے کہ انھوں نے ہزار و صد و "چہل و چند" میں وفات پائی، عاشقی نے کسی سند کے بغیر ۱۱۵۰ھ تحریر کیا ہے اور "فصاحت شعار" سے تاریخ نکالی ہے۔ دیوان تاباں میں ایک قطعہ تاریخ ہے، جس کے دو شعر یہ ہیں:

جی میں آیا کہ میں کہوں تاریخ   کیونکہ تھا اس سے دوستی کا نام

غیب سے یک بیک ندا آئی تجھ کو جنت ہوئی نصیب پیام

مصرع آخر کے نیچے ۱۱۵۷ مرقوم ہے، لیکن اس سے ۱۱۵۸ نکلتا ہے، اگر تخرجہ کی ہدایت ہے تو "یک بیک" اسپر شعر ہے، مگر کس طرح یہ میری سمجھ میں نہیں آتا۔ صحیح ۱۱۵۷ھ ہی ہے، اور مخلص نے جو پیام کے خاص دوستوں میں تھے، مرآۃ الاصلاح (نسخۂ پٹنہ ورق ۱۸۵) میں یہی لکھا ہے۔ انھوں نے یہ بھی بتایا ہے کہ ۲۸ محرم کو وفات ہوئی اور دہلی میں دروازۂ شاہ مرداں کے نزدیک دفن ہوئے۔ اس کتاب میں حشمت کا قطعہ بھی ہے، "تاریخ: "بارسول اللہ باد حشر پیام روز جزا"۔

سرخوش مصنف کلمات الشعرا نے خود لکھا ہے کہ میرا سال ولادت ۱۰۵۰ "افضل اہل زمانہ" سے نکلتا ہے، خوشگو کا قول ہے کہ سلخ محرم ۱۱۲۶ھ میں وفات ہوئی، تاریخ از سبقت: "افضل دہور" از حکیم چند، ندرت: "زجہاں رفت آہ عارف آہ"۔

سکھراج، سبقت مالوہ میں مقتول ہوئے شعبان ۱۱۳۸ھ، ندرت نے تاریخ کہی: "ہائے سکھراج زما سبقت کرد" لیکن اس میں ایک سال زیادہ تھا، خوشگو نے اسے اس طرح درست کیا: "کرد سکھراج زما سبقت ہا" (خوشگو)

بھوپت رائے، متخلص بہ بانیہ وفات دہلی ۱۱۳۹ھ (خوشگو)

عطاء اللہ عطا امروہوی وفات ۱۱۳۶ھ (خوشگو)

مرزا ارجمند متخلص بہ جنوں و آزاد پسر قبول جوانی میں ۱۱۳۲ھ میں وفات

(خوشگو)

شیورام داس حیا عمر چہل وچند سال وفات آگرہ ۱۱۴۴ھ (خوشگو)

امام الدین متخلص بہ ریاضی خلف لطف اللہ مہندس وفات ۱۱۴۵ھ (خوشگو)

محمد ماہ صداقت برادر غنیمت وفات ۱۱۴۸ھ (خوشگو)

مغل خاں متخلص بہ قابل وصنعت وفات ۱۱۴۲ھ (خوشگو)

خواجہ محمد عاقل، عاقل وفات ۱۱۴۳ھ (خوشگو)

احمد عبرت شاگرد بیدل وفات ۱۱۲۵ھ (خوشگو)

امام قلی خاں منتہی وفات ۱۱۱۰ھ (خوشگو)

بزمِ معاصر

معاصر حصہ ۵ میں ایک مثنوی جوہری کی طرف منسوب کی گئی ہے، جناب کلیم الدین احمد صاحب نے اطلاع دی ہے کہ یہ راسخ کے دیوان مطبوعہ میں موجود ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس کے کچھ اشعار ہیں اور کچھ نہیں، اور جو ہیں وہ بھی لازماً اسی طرح نہیں جس طرح دیوان میں ہیں۔ یہ حقیقت ہے کہ جوہری کا اس سے تعلق نہیں۔

ولی ویلوری

کی

دہ مجلس کا ایک قدیم اور معتبر مخطوطہ

فضائل و مصائبِ اہل بیت اطہار، شہادت امام حسین علیہ السلام اور واقعات کربلا پر متعدد منظوم کتابیں اور مثنویاں دکنی زبان میں لکھی گئیں۔ ان میں بیشتر ملا حسین بن علی واعظ کاشفی کی مشہور فارسی مثنوی روضۃ الشہدا سے ماخوذ ہیں یا اس کا ترجمہ ہیں۔ کچھ دکنی مثنویوں کا نام بھی روضۃ الشہدا ہے۔ یہ زیادہ تر دس فصلوں یا مجلسوں پر مشتمل ہوتی ہیں۔ اس لئے انہیں دہ مجلس بھی کہتے ہیں۔ بارہویں صدی ہجری میں متعدد کتابیں اس موضوع او طرز پر لکھی گئیں۔ شمالی ہندوستان میں بھی مراثی اور مجالس عزا کا چرچا تھا۔ چنانچہ دہلی کے فضلی کی دہ مجلس جو نثر میں تھی اور کمیاب بلکہ نایاب ہے، اسی صدی کے اواسط میں لکھی گئی۔ مصنفین و مولفین کا اہل تشیع ہونا لازمی نہ تھا، احناف اہل سنت اور صوفیائے کرام کو بھی اہل بیت اطہار اور بالخصوص امام حسین علیہ السلام سے بے حد لگاؤ اور سچی عقیدت تھی۔ حتیٰ کہ شاہ عبدالعزیز دہلوی مصنف تحفۂ اثنا عشریہ جیسے نقشبندی سلسلہ کے جلیل المرتبت بزرگ کے قلم کو بھی اس موضوع پر جنبش ہوئی اور سرالشہادتین لکھ کر آپ نے آنسو بہائے اور دوسروں کو بھی غم ناک کیا۔ کچھ لوگوں نے ولی اورنگ آبادی سے بھی جو بہت دنوں تک

اور غلط طور پر "نظم اردو کی نسل کا آدم" سمجھے جاتے رہے۔ ایک دہ مجلس منسوب کی ہے اور کلیات میں چند اشعار بھی چھپ گئے ہیں لیکن جیسا کہ ہاشمی صاحب اور زور صاحب نے لکھا ہے یہ اشعار ولی اورنگ آبادی کے نہیں ہیں بلکہ ان کے ہم عصر ولی ویلوری کے دہ مجلس کے ہیں۔ کتب خانہ کلیہ جامعہ عثمانیہ حیدرآباد کی فہرست اردو مخطوطات مرتبہ پروفیسر عبدالقادر سروری کے صفحہ ۹۲ کے حاشیہ میں پروفیسر بلوم ہارٹ کے اس خیال کا حوالہ دیا گیا ہے کہ روضۃ الشہدا کا ولی اورنگ آبادی نے بھی ترجمہ کیا تھا۔ صفحہ ۱۴۱ میں دو شعروں سے جن میں سنہ ۱۱۳۰ھ اور سنہ ۱۱۴۳ھ کی تاریخیں دی گئی ہیں یہ استدلال کیا گیا ہے کہ ولی اورنگ آبادی کا وصال ان ہی دو تاریخوں کے درمیان ہوا۔ صفحہ ۱۴۰ میں دہ مجلس منظوم کو ولی اورنگ آبادی کی تصنیفات میں شمار کیا گیا ہے۔ لیکن صفحہ ۱۰۶ میں ولی ایلوری اور شیدائی حیدرآبادی کے دکھنی زبان میں دو منظوم نسخوں کا نام روضۃ الشہدا اور روضۃ الاطہار بتایا گیا ہے۔ صفحہ ۱۱۱ میں ولی ایلوری کے ترجمہ روضۃ الشہدا کی مجلس دہم کے خاتمے کے اشعار نقل کئے گئے ہیں:

کیا ہوں ختم جب درد کا حال	اگیارا سو پہ تھا سیں تیسواں سال
نشان اس درد میں ہے زندگی کا	زمانہ مہدی آخر زماں کا
نشان ہے دولت و پابندگی کا	اٹھا اس باعث امن و اماں کا
ولی اب رکھ قلم اور ختم کر بات	نبی ہور آل اوپر بھیج صلوات

پہلا شعر صفحہ ۹۲-۹۳ میں اس طرح مندرج ہے:

کیا ہوں ختم یو درد کا حال	اگیارہ سو اوپر تھا تیسواں سال

ان اشعار کی اصلی صورت کیا تھی یہ تو آئندہ سطر سے واضح ہوگا۔ لیکن ہمیں سروری صاحب جیسے نقاد سے توقع تھی کہ ولی اورنگ آبادی اور ویلوری کے مخلوط ہو جانے اور دہ مجلس کے معاملہ کو مبہم چھوڑ دینے کے الزام کا موقع نہ دیں گے۔

مدراس کے سرکاری کتب خانہ کے "اورینٹل" مخطوطات کے فہرست نگار نے بھی کسی قدر الجھن میں ڈال دیا ہے انہوں نے روضۃ الشہدا کے دو اردو منظوم نسخوں کا ذکر کیا ہے جس میں ایک کے صفحات کی تعداد ۳۵۶ دوسرے کی ۳۳۲ ہے اور بتایا ہے کہ دکنی زبان میں یہ کتاب جو صاحبان تشیّع میں بڑی مقبول تھی۔ شیخ عبدالرسول کی تصنیف ہے۔ یہ عبدالرسول کب تھے، کون تھے اور کہاں کے رہنے والے تھے ان باتوں کی طرف کچھ اشارہ نہیں کیا گیا۔ لیکن شروع اور خاتمے کے چند اشعار قدرے اختلاف کے ساتھ نقل کئے گئے ہیں، ان کی صورت یہ ہے:

آغاز

کروں نامہ کوں بسم اللہ سوں آغاز	اچھوں تا میں فصاحت میں سرافراز
سراون کیا اسے جن یک سخن میں	بندیا جو دم کدر(؟) رفتنی سوں بدنمیں
حکیم ایسا کہ لا کر دست تدبیر	نکالی چھاردانی کا حکم خیر
فلک کے ہاتھ سے خورشید کا جام	پھرا کر دور کرتا صبح سوں شام

خاتمہ

پڑھنی کوں یکو کمر دن رات گوشہ	کیا ہوں آخرت کا اپنی توشہ
یو نامہ درد کا جو کوئی کرے تیر	پڑھی حق میں میری یک فاتحہ خیر

فہرست نگار نے صحیح طور پر اس کتاب کو بجائے مرثیہ کے اسلامی تاریخ قرار دیا ہے

اور مصنف اردو شہ پارہ نے بھی یہ لکھ کر اس کی تصدیق کی ہے کہ یہ کتاب مرثیوں کا مجموعہ نہیں بلکہ خاندان رسول کی جنگوں اور شہادتوں کی ایک تاریخ ہے اس کے داخلی شواہد کے متعلق آئندہ کچھ عرض کیا جائے گا۔

مولف اردوے قدیم اور نصیرالدین ہاشمی صاحب نے البتہ صاف صاف طور پر ولی ویلوری کو دہ مجلس کا مصنف قرار دیا ہے اور زور صاحب بھی یہی کہتے ہیں۔ اول الذکر اور آخرالذکر حضرات نے مصنف کا نام سید محمد فیاض بتایا ہے ہاشمی صاحب میر ولی فیاض پر زور دیتے ہیں۔ سروری صاحب نے اشارہ میں "ولی محمد" (میر فیاض) لکھا ہے اور صفحہ ۹۲ میں فرماتے ہیں کہ "محمد فیاض ولی" دکنی نے ۱۱۰۹ھ میں روضتہ الشہدا کا نظم میں ترجمہ کیا۔ اس بیان کے ثبوت میں کوئی چیز نہیں دی۔ ہاشمی صاحب مولف دکنی مخطوطات نے ولی ویلوری کے ایک رشتہ دار کے نسب نامے "میر ولی فیاض" کے نام پر اپنی مہر تصدیق ثبت کی ہے اور بتایا ہے کہ یہ شیعہ تھے۔ شاعری ان کا پیشہ نہ تھا۔ ابتدا میں فوجی ملازمت کرتے تھے۔ ان کی پیدائش ویلور علاقہ مدراس میں ہوئی۔ حراست خاں نواب ضلع سات گڈھ کے متوسلین میں تھے۔ بعد ازاں قلعہ داران سدھوت کے ملازم ہو کر کڑپہ چلے گئے جہاں نواب عبدالمجید یا عبدالحمید خاں قلعدار تھا اور وہ ان کی بڑی عزت کرتا تھا۔ ان کی پیدائش و وفات کی تاریخ معلوم نہیں۔ ارکاٹ کے محلہ اسد پور میں ان کا مزار واقع ہے۔ مولف اردو شہ پارے نے بھی یہی باتیں لکھی ہیں۔ مزار کا ذکر نہیں کیا۔ ولی ویلوری کو پر گو شاعر بتایا گیا ہے۔ ان کی تصانیف میں دو ضخیم کتابیں روضتہ الشہدا اور رتن و پدم کے علاوہ چند چھوٹی چھوٹی مثنویاں بھی ہیں ایک دعا فاطمہ

اور ایک پچاس اشعار کی مناجات بھی ان سے منسوب ہے رتن و پدم میں چتوڑ کے راجہ رتن سین اور لنکا کی راجکماری پدمنی کی عشقیہ داستان جائسی کی مشہور ہندی نظم پدماوت کی مدد سے منظوم کی گئی۔ اس میں چار ہزار اشعار تھے اور ڈاکٹر اسپرنگر نے اودھ کے شاہی کتب خانہ میں جو نسخہ اس کا پایا تھا اس کے صفحات کی تعداد چار سو تھی۔ رتن پدم کا مخطوطہ تو ناپید ہے لیکن روضۃ الشہدا یا دہ مجلس کے کئی نسخوں کا پتہ چلتا ہے اور اسے مطبوعہ بھی قرار دیا گیا ہے۔ اس میں ولی ویلوری کے ذاتی حالات کی طرف کچھ بھی اشارہ نہیں پایا جاتا۔ لیکن رتن پدم میں ملازمت کا حال شاید درج تھا۔

ہاشمی صاحب نے دہ مجلس کے متعدد اشعار کو جو مختلف مقامات سے لیے گئے، نقل کرنے کے بعد مختصر طور پر کلام پہ تبصرہ بھی کیا ہے۔ لکھتے ہیں کہ ولی ویلوری ایک کہنہ مشق شاعر تھے جن پر مذہب اور تصوف کا رنگ غالب تھا۔ ان کی یہ تصنیف شاعرانہ خصوصیات اور نکات سے خالی نہیں ہے جس سے بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے کہ شاعر کا پایہ اس فن میں کس قدر بلند تھا۔ واقعات نگاری، جنگ کے حالات، حملہ کا سماں وغیرہ جس خوبی سے بیان کئے گئے ہیں وہ شاعر کی اعلیٰ قابلیت کے شاہد ہیں۔ گو محی الدین زور صاحب کو یہ کتاب دلچسپ نظر نہیں آئی اور اس کے ۵۰۰ اشعار کا مطالعہ بڑا صبر آزما ثابت ہوا لیکن جہاں ۴۳ اشعار کا اقتباس پیش کیا ہے وہاں لکھتے ہیں "خالص مذہبی موضوع ہے اور مصنف بھی ٹھیٹ مذہبی آدمی ہے لیکن نظم دلچسپی اور ادبیت سے خالی نہیں گو ولی اورنگ آبادی کا مقابلہ نہیں کیا جا سکتا۔" ہمیں افسوس ہے کہ رتن و پدم کا نسخہ موجود نہیں اور

ولی اورنگ آبادی نے اس خاص موضوع پر کوئی کتاب نہیں لکھی اس لئے تقابل کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔ انیس و دبیر نے اپنے مراثی میں جو ادبی معجز نمائی کی اور جس قدر ایک محدود دائرہ میں خود کو رکھ کر زبان اردو کی خدمت کی اس کی توقع ان کے پیش رؤں سے کرنا مناسب نہیں پھر بھی ویلوری ولی قادر الکلام شاعر تھے اور کس حد تک اپنے کلام کی وجہ سے سراہنے کے قابل ہیں۔ اس کا کچھ اندازہ ان کی کتاب کے بالاستیعاب مطالعہ سے ہی ہو سکتا ہے۔ ہاشمی صاحب نے اس مثنوی کے کئی نسخوں کا ذکر کیا ہے۔ تین ہندوستان میں اور تین ہندوستان کے باہر۔ ان میں ایک تو خود ان کے پاس تھا، دوسرا کتب خانہ آصفیہ میں اور تیسرا انجمن ترقی اردو کے کتب خانہ میں۔ یورپ کے جن تین نسخوں کا حوالہ دیا ہے ان میں دو انڈیا آفس میں ہیں اور ایک روائل ایشیاٹک سوسائٹی لندن میں۔ قدیم ترین نسخوں کی تاریخ کتابت ۱۱۸۷ھ اور ۱۱۸۸ھ بتائی گئی ہے۔ تعجب ہے کہ جس کی نظر سے اتنے متعدد اور کچھ بہت قدیم نسخے بھی گذرے اور وہ دکنی زبان کی خصوصیات اور غریب تراکیب سے بھی واقف ہو۔ پھر بھی نقل کردہ طویل اقتباسات میں کئی غلطیاں پائی جاتی ہیں جو غالباً کاتب یا پریس کی زیادتیوں پر محمول کی جائیں۔ مزید برآں کچھ کام کی باتیں جو کتاب کے بالاستیعاب مطالعہ سے برآمد ہوتی ہیں ان پر بھی ہاشمی صاحب اور زور صاحب کی نظر شاید نہ پڑ سکی۔

پٹنہ یونیورسٹی کے کتب خانہ کے شعبہ مخطوطات میں دکنی زبان کی کئی کتابیں داخل کی گئی ہیں ان میں ایک ضخیم مثنوی بھی ہے جس پر کتاب کا نام سرخ روشنائی میں روضۃ الشہدا مندرج ہے ۳۷۶ صفحات کی یہ ضخیم مثنوی جس کے سطور کی

تعداد ۱۵ تقطیع ۱۰×۵ ۳/۴ خط نسخ نما نستعلیق ہے جس کا کاغذ دیسی' دبیز' میلاپن
لئے ہوئے سفید اور پائدار ہے۔ مکمل اور بہت قابل اعتبار معلوم ہوتی ہے اوراق
پاشاں ہیں اور قدرے کرم خوردہ لیکن بجز چند مقامات کے جہاں عبارت مالیقرا نہیں
مطالعہ کرنے والے کو کوئی خاص دشواری کا سامنا کرنا نہیں پڑتا۔ یاے معروف
اور یاے مجہول کا امتیاز البتہ کاتب نے ملحوظ نہیں رکھا اور اس زمانہ کے دستور کے
مطابق ک اور گ کا فرق ناظر کے استعداد علمی کے حوالہ کر دیا گیا ہے۔ ترقیمہ کی
عبارت حسب ذیل ہے: "چوں موجب فرمائش شیر محمد صاحب کمترین حالات ! ز
کہترین مخلوقات سید افضل مسافر بیت اللہ شرفاً و تعظیماً بنظم قلم استطاعت
خود بتاریخ دویم شہر ربیع الثانی سنہ ۲۲ اختتام و تمام نمود امید از توجہات ذرہ
پروری دوربین قاریان ہذا الکتاب آں دارد کہ حرف سہو را بقلم عنایت محو فرمانند۔"
سنہ ۲۲ محمد شاہ بادشاہ دہلی کے سنہ جلوس کی شاید خبر دیتا ہے یعنی سنہ ۱۱۵۲ھ
مطابق سنہ ۱۷۴۲ء آخر کے چند اشعار یہ ہیں: ؎

رقم کرنا سب اس درد و الم کوں — کہاں یارا ہے اس قاصر قلم کوں
محمد مصطفیٰ نے آل کے باب — جنا امت سوں پائے رنج ہور تاب
تو بہا کوئی بتیا (مسافرت) ہمیں وردیایا — نہ کسی کے آل پر تہا یوں سمایا
خصوصاً آل میں جو اوصیا تھے — شرف میں ہم نظیر انبیا تھے
دلی ہے سب سوں اگلا انکوں آزار — لو امت کے سیہان جفاکار
نبی کے آل کا یو درد ماتم — صحادت ہے جو رکھنا (رکھنا) دل منیں غم
نشاں اس درد میں ہے زندگی کا — سبب ہے دولت پائندہ گی کا

یو روضے کوں پکڑ دن رات گوشہ کیا ہوں آخرت کا اپنا توشہ
یونامہ درد کا جو کوئی کرے سیر پڑھے حقمیں مرے یک فاتحہ خیر
محمدؐ ہور علیؓ ہور فاطمہؓ سب کریں عاصی کوں اس اپنا مقرب
کیا ہوں ختم جب یو درد کا قال اگھارہ سو پو تھا سن تیسواں سال
نرمانہ مہدی آخر زماں کا اتھا اس باعث امن واماں کا
دلی اب رکھ قلم ہور ختم کر بات نبی ہور آل اوپر بول صلوات

ان میں گیارہواں شعر جو اہم ہے اور سنہ تصنیف ۱۱۳۰ کا پتہ دیتا ہے، ہاشمی صاحب کو وزن کے لحاظ سے موزوں نہیں معلوم ہوتا۔ اس لئے کہ وہ اسے اس طرح پڑھتے ہیں: ؎

کیا ہوں ختم جب یو درد کا حال اگیارہ سو اوپر تہا تیسواں سال

مؤلف اردوے قدیم نے تو اور بھی زیادتی کی ہے کہ سنہ ہی کو بدل ڈالا۔ سروری صاحب کے نقل کردہ اشعار اور پیش نظر نسخہ کے اشعار میں جو اختلاف ہے اور کسی کی قرأت کتنی صحیح اور معتبر سمجھی جاسکتی ہے اس کے متعلق کچھ لکھنا تحصیل حاصل ہے۔

ہاشمی صاحب نے شروع کے صرف دو اشعار اور کتب خانہ مدراس کے فہرست نگار نے صرف چار اشعار نقل کئے ہیں۔ قبل اس کے کہ تمہیدی اشعار کو جو حمد و نعت اور ایک واقعہ پر مشتمل ہیں، پٹنہ یونیورسٹی کے مخطوطے سے نذر قارئین کیا جائے مناسب معلوم ہوتا ہے۔ شمالی ہندوستان والوں کو دکنی شعرا کے کلام کا مفہوم پوری طرح سمجھنے اور دکن کی قدیم و مروج زبان کے غریب الفاظ و کلمات

مترادفات اور عروض و قواعد کی مخصوص ترکیبوں سے جو دشواریاں لاحق ہوتی ہیں، ان کی طرف اشارہ کر دیا جائے۔ ان دقتوں کا سامنا کرنے وقت چند موٹی موٹی باتوں پر دھیان دینا ضروری ہے۔ راقم السطور خود دکنی زبان سے ناواقف ہے لیکن کتابوں کے مطالعہ سے چند باتوں کی طرف توجہ منعطف ہو جاتی ہے۔ خاص ٹھیٹ دکنی زبان میں لفظوں کی بہت سی ایسی صورتیں ملتی ہیں جنہیں بلا سوچے سمجھے غلط یا غیر فصیح کہہ دینا مناسب نہیں ہے۔ ضرب الامثال محاورات حروف کے حرکات تذکیر و تانیث، املا، بندش الفاظ غرض بہت سی باتوں میں دکنی اور شمالی ہندوستان کی قدیم اردو بہت کچھ ایک دوسرے سے مختلف دکھائی دے گی۔ خود شمالی ہندوستان کے متقدمین شعرا کے کلام میں بہت سی ترکیبیں، محاورات، کلمات ملتے ہیں جو زبان کے منجھ جانے سے اب متروک ہو گئے ہیں۔ اپنے اپنے زمانے اور ماحول کے لحاظ سے قدیم چیزیں جو فصیح و سلیس و صحیح سمجھی جاتی تھیں آج ان میں سے بیشتر نامطبوع قرار دیدی گئی ہیں۔ ادب میں بھی بقائے اصلح اور ارتقا کا اصول کارفرما ہوتا ہے۔ خود دکنی کا کوئی اردو ادیب اور کی جگہ ہور ——— جتنا کو جتا ——— یوں کو یو ——— سے کو سوں ——— ستی! سیتی ——— ہوں کو اچھوں ——— حرف ربط تہا کو اتہا ——— بند ہا کو بندیا ——— رکھا کو رکھیا ——— بعد ازاں کو بزاں ——— نیا کو نوا ——— بڑھے کو برے ——— نہیں کو نئیں ——— طرح کو ننن ——— اس قدر کو اتا ——— کتنا کو کتا ——— کہنے میں کو کہتے ہیں۔ اسی طرح اوپر اور پر کو پو ——— مجھ کو موج یا منجے ——— جو کو جیوں ——— جب تک کو جب لگ ——— جو کچھ کو جکچ ——— کے کو نے ——— کو کو توں ——— پہچاننا کو پچھاننا ——— بھی کو بی ——— کبھی کو کبی ——— یہ کو یو ——— آ گئے کو آگو ——— اس قدر کو اتا ——— کتنا کو کتا ——— کہا کو کیا ——— پرکھنا کو پرکنا ——— سچا کو سچا ———

دیکھا کو دیکھے ۔ کہاں کو کاں ۔ پوچھا کو پوچھے ۔ کہا کو کہے ۔ آگے کو آگو ۔ پہنے کو پینے ۔
کہا کو کہی ۔ ہالہ کو ہالو ۔ رکھا کو سہارڈا ۔ کہنا کو کنا ۔ نزدیک کو کنے ۔
دیکھ کو دیک ۔ دکھائی دینا نظر آنا کو دسنا ۔ لائق وقابل کو جوگ ۔ شخص یا مرد
کو جنا ۔ جسنے کو جنے ۔ اتنے کو اتے ۔ تم اور تمکو تمن تمنا ۔ انکو کو انوں کوں ۔
اُس نے اِس نے کو اُنے اِنے ۔ منہ کو موں ۔ میں کو منے ۔ بہت کو بوت یا
بہوت یا اتا ۔ بات ہاتھ کو باتاں ہاتھا یا ہاتھ ۔ اس طرح کو یوں ۔ ختم کروں پورا
کروں کو سراؤں یا پراؤں ۔ تو ایسا کو تو یسا ۔ سو کہا کو سوکا ۔ رہا کو رہیا ۔
زمین کو بھیں ۔ پاس کو کنے ۔ کو کو کوں ۔ اپنا کو آپس ۔ اندھیرا کو اندھارا ۔ لکیر کو
لکیر ۔ ہزار کو سہس ۔ خون کو رکت ۔ غیرت کو روس ۔ پاوں کو پگ یا پگن ۔
تلوار کو تروار ۔ جس کی وجہ سے کو نس ۔ تب تک کو تداں تک ۔ اب تک کو
ادھوں ۔ باہر کو باہار ۔ زیادہ کو ادھک ۔ رہو کو آچھو ۔ مانند کو نمن ۔
پانی کو نیر ۔ نام کو ناوں ۔ ہمیشہ کو سداں ۔ سر کو سیس ۔ دشمن کو کال یا دندی ۔
بیٹھنے کو کنک ۔ کبھی کو کدھی ۔ جدا کو نیارا ۔ نہیں کو نہنچہ ۔ ہوا کو پون ۔ آسمان
کو گگن یا اکہم ۔ اٹھانا کو اچھانا ۔ جھڑپ کو اوجھڑ ۔ گھر کو بھوں وغیرہ نہیں
لکھا جائے گا ۔

سروری صاحب نے فہرست اردو مخطوطات کے صفحات ۲۴ ۔ ۲۵ میں
قدیم دکنی اردو کی چند خصوصیات و امتیازات کو نمایاں کیا ہے اور پروفیسر عبدالستار
صدیقی نے دیوان ولی کے ایک مطبوعہ نسخہ میں دکنی اردو کے لسانی خصوصیات پر ماہرانہ
نظر ڈالی ہے ۔ محی الدین زور صاحب نے بھی اردو شہ پارے جلد اول کے آخر میں

ایک مختصر فرہنگ کا اضافہ کیا ہے ۔ قطب مشتری کے اڈیٹر نے بھی غریب الفاظ کے
معنی شامل کیے ہیں ۔ انہیں پیش نظر رکھنے سے بڑی آسانی ہوتی ہے ۔ گو شمالی ہند
کے قارئین کی ساری مشکلیں حل نہیں ہوتیں ۔ ضرورت ہے کہ دکن کے خصوصی مصطلحات
کا ایک جامع فرہنگ تیار کیا جائے اور یہ کام صاحبان حیدرآباد دکن ہی کر سکتے ہیں
بہر کیف ولی ویلوری کے کلام کا مفہوم سمجھ میں آجاتا ہے اور خوبیوں اور نقائص کا بھی
اندازہ کرنا بہت دشوار نہیں ۔ جو اشعار ہمیں وزن سے گرتے ہوئے اور ناموزوں
معلوم ہوتے ہیں وہ حقیقتاً ایسے نہیں ہیں ۔ ایک بات کا خاص خیال رکھنا ضروری
ہے اکثر افعال میں آخری حرف الف کے بجائے یا لاتے ہیں جیسے رہا کی جگہ رہیا ۔
بندا (یعنی بندھا) کی جگہ بندیا ۔ رکھا کی جگہ رکھیا ۔ ستارا کی جگہ ستاریا وغیرہ اس
مخلوط "ی" کا تلفظ نہیں ہوتا ۔ ——— تمہیدی اشعار میں بھی اس کی کئی
مثالیں ملتی ہیں :

کروں نا میکوں بسم اللہ سوں آغاز — اچھوں تا میں فصاحت میں سر افراز
سراون کیا ایسے جن یک سخن میں — بندیا جیو دکے رشتے سوں بدن میں
حکیم ایسا کہ لا کر دست تدبیر — نکالے مور دانیکا شکم چیر
فلک کے ہاتھ دے خورشید کا جام — پھرا کر دور کرتا صبح سوں شام
بنا تکے محل پر طاق ابرو — رکھیا لا اسیں انکھیاں کے دیدے (۹) دو
دکھائی اپنی باریکی ہنر کی — لگایا چکمیں چنگاری نظر کی
لگایا شاخ تنسوں گل ذہن کا — ثمر بخشا اسے شیریں سخن کا
بنی آدم سوں دھرتی کوں سنواریا — گگن کوں سب ستاریاں سوں چتاریا

سبت (ہ) کا سنیا (ہ) ہی تخم گلی بی نگلیں — آدمی کی پلک دل بیں !
ولی جس نے محبت سکا کیا لاف — کیا میں اسکوں پہ کوں ہو کو صراف
جسے جتنا محبت ہور ولا ہے — سوا وا تنا بلا میں مبتلا ہے
اَلَسْتُ بِرَبِّکُمْ کا جب صدا تھا — جواب اس کا نعم سنکر بلا تھا
جکو نبی تھے اس صلا میں ست مدہوش — بلا اوپر بلا کوں کر گئے نوش
دسے او جوں زرخالص محک پر — تنا ان کا رہیا ساتوں فلک پر
کہوں صلوٰۃ بیحد مصطفیٰ پہ — ہور اس کے آل پاک باصفا پہ

اس کے بعد اور مجلس اول کے پہلے بیس[20] اشعار ہیں جن میں کتاب نسخۂ کنز الغرائب سے ایک واقعے کو نظم کیا گیا ہے۔ جناب فاطمہ رضؓ امام حسین علیہ السلام کو ایک نیا جامہ سی کر پہناتی ہیں اور حضرت نبی مرتبت کے پاس انہیں بھیجتی ہیں۔ گریبان کی تنگی اور تکمہ کھولنے کی ضرورت سے حلقوم مبارک پر نظر پڑتی ہے۔ جبریل امیں حکم باری پہنچاتے ہیں کہ ظالموں کا خنجر اسی جگہ رواں ہوگا۔ چند ٹکڑے پیش کئے جاتے ہیں:

انھا جو اصل میں ابن الذبیحین — سبب جس کے ہوا ایجاد کونین
ہوا جس سوں شرف سب خاکیاں کو — تجلی منجلی افلاکیاں کوں
محمد سید اولاد آدم — نبوت کے اتھا فرماں پو خاتم
سو جیسے نے مصیبت پاکو بیحد — کیا یا لیت لم یخلق محمد
غرض جو آکو یاں پر دام دیکھیا — کدہی محنت کدہی آرام دیکھیا
نلی خاصا نگوں لے محنت میں پایا — بلا میں نت رکھیا جب لگ جلا یا
دیکھو در نسخۂ کنز الغرائب — حکایت یو لکھیا ہے بس عجائب

کہ یکدن فاطمہ خاتون جنت　　خدا سوں نت اچھو انپر تحیت
نوا جامہ حسین سرور کے تن میں　　پنائی سیکو جوں گل پیرہن میں
کئی حضرت کی تم خدمت میں جاودو　　نوا جامہ لو پینے سو دکھا دو
سو جا شہزاد حضرت کے انگنیں　　کھڑے رہے تھے صنوبر جوں چمنیں
نبی نے دیک جلدی سوں بلائے　　ہوئے کر پیار سینے سوں لگائے
دئیے بنداز ایسے گو نہیں نہارا　　دسے جوں چاند کے پہلو میں تارا
او جامہ دیک کر حضرت نے بولے　　گریباں تنگ ہے تکمیں کو کھولے
دیکھی گردن پو کرواہو کو دلگیر　　اُبل حضرت کی نیناں سوں چلیا نیر
ترت جبریل لایا حکم باری　　کیئے کردیکھ (؟) اتنا جیو کوں بھاری
صبا (؟) جب ظالماں یو کرینگا　　جہاں کرواہے واں خنجر پھرینگا
یوسن غم گیں ہو حضرت آہ مارے　　ترق دل نعرۂ اللہ مارے
عزیزاں سچ یو غم ایسا ہے مشکل　　گلا پانی کیا ہے کوہ کا دل

ان اشعار میں اتھا = تھا ۔ پاکو = پاکر ۔ کیا = کہا ۔ کدہی = کبھی ۔ تت = ہمیشہ ۔ جب لگ = جب تک ۔ اچھو = ہو ۔ نوا = نیا ۔ نہارا = رکھا ۔ دسی = دکھائی دے وغیرہ سے دشواری پیدا نہیں ہوتی ۔ لیکن کروا جو تین جگہ آیا ہے اور صبا کا مفہوم سمجھ میں نہیں آتا ۔ اول الذکر سے شاید حلقہ دار تکمئیں یا لکیریں مراد ہوں جیسے ہندی میں تربلی کہتے ہیں اور گردن میں ہوتی ہیں ۔ دکنی میں صبح کو صبا گو بولتے ہیں ۔ مگر یہاں اس کے کوئی معنی نہیں ۔ ممکن ہے صباں ہو جس کے معنی ہیں کلیہ یا آئندہ ۔

لیکن جو چیز زیادہ جاذب نظر ہے وہ کنز الغرائب کا ذکر ہے ماخذ کسی کی حقیقت سے ۔

مجلس دہم میں بھی ایک جگہ اسی کا حوالہ دیا گیا ہے ؎

سو ان میں سے حکایت ایک ہے پھر　　دکھو کنز الغرائب بیچ نادر

کسی جگہ مولانا واعظ کاشفی کے روضۃ الشہدا کا ذکر نہیں ملتا۔ حالانکہ کہیں کہیں اور لامعلوم ماخذات کی طرف اشارات ملتے ہیں مثلاً ایک جگہ ولی فرماتے ہیں ؎

بڑا ہے جو سیر کا ایک رسالہ　　دکھوا سمیں حکایت یو تیرا لا

ایک مقام پر یہ شعر ملتا ہے ؎

جو اسمٰعیل نے لایا حکایت　　ابی الحنوتی سوں اوکر روایت

مجلس پنجم میں ایک جگہ لکھتے ہیں ؎

کسی نسخے میں شیخ معتبر نے　　حکایت یو لکھا ہے نامور نے

مجلس دوہم کے بھی ایک دو شعر اس ضمن میں قابل ذکر ہیں ؎

لکھے ہے صاحب حسن القضا نے　　دکھو سلطان علی موسیٰ رضا نے

حسین اوپر جکوئی عاشور کے دن　　روئیگا ہو کو غمگیں مرد مومن

اس کے بعد کے چند اشعار بھی لائق توجہ ہیں ؎

کرینگا ترک دنیا کی جہاں ست　　خدا برلائینگا سب اس کے حاجات

اگر چہتے ہی تم جنت میں جانے　　شہید ان کے سریکا اجر پانے

کرینگے یاد واقع شاہ کا جو　　نہ تہے اس وقت ہم افسوس کرکو

اگر اچھے ہمیں اس روز رن پہ　　نوچھو کرتے فدا شہ کے چرن پر

ان اشعار میں "ابکی وتباکی" کی تسبیعی حدیث کی طرف اشارہ کیا گیا ہے اور "یالیتنی کنت معھم فافوز فوزاً عظیماً" کی جس کا اعادہ ذاکرین سید الشہدا اور محرم میں کربلا

کے سوگ منانے والے اہل تشیع بار بار کرتے ہیں، تشریح کی گئی ہے۔ داخلی شواہد سے ولی ویلوری کا تشیع ثابت ہے۔

شیعوں کی روایت ہے کہ جناب فاطمہ نئے ماحول سے بہت ملول و مکدر و منغض رہتی تھیں "صُبَّتْ عَلَیَّ مَصَائِبُ لَوْ اَنَّهَا۔ صُبَّتْ عَلَی الْاَیَّامِ صِرْنَ لَیَالِیَا" انہیں معظمہ کا شعر بتایا جاتا ہے۔ وصیت کی تھی کہ جنازہ پر دعوت عام یا خاص نہ دی جائے۔ ولی ویلوری نے یہ سب تو نظم نہیں کیا لیکن یہ ضرور لکھا ؎

جنازہ مج نکو کر فاش گاڑو　　رین (رات) میں جوں نبات النعش گاڑو

مگر مناسب توجیہہ سے معاملہ کو کافی ہلکا کر دیا ہے ؎

اتھی میں زندگی میں جیونکہ مستور　　موئی بعد از ہی اچھا اوچ دستور

جناب سیدہ نے دعار مغفرت بھی کی ؎

مرے والد کی امت پر رحم کر　　گنہ گاراں سو سارے درگزر کر

بخشنا سبکوں توں اپنے رحم سوں　　کرم سوں مغفرت کرنا کرم سوں

ولی حضرت علی کی منقبت میں بھی بہت رطب اللساں ہیں ؎

علی سلطان سارے اولیا کا　　علی سردار سارے اوصیا کا

خطاب اسکوں امیر المومنیں ہے　　خدا سوں والی دنیا و دیں ہے

امام اول از اثنا عشر ہے　　فضیلت میں سبھو نسوں بیشتر ہے

کہا جائے گا کہ اکثر صوفیا بالخصوص جو اولادِ علی ہونے کا فخر و شرف رکھتے تھے تفضیلی عقائد کا اظہار کرتے ہیں۔ حضرت شاہ آیت اللہ جوہری پھلواروی بھی "فصل بہاراں" حضرت علی کو قرار دیتے ہیں۔ لیکن ولی ویلوری کے کچھ شعر تو ایسے ضرور ہیں جو ان کے

صحیح عقیدہ کی غمازی کرتے ہیں۔ مجلس اول کا واقعہ غدیر خم سے کرتے ہیں ؂

نبی نے حج جو آخر گذارے وداع ہووانکے عالم سوں سدھارے
وہاں سوں چل کو او خورشید منزل اُتاریا آ غدیر خم میں محمل
ہوا اس وقت واں ایسا گرم تہا جو خارا موم سا گلنے نرم تھا
کئے سوگند میں یا انسوں نجاؤں جکچ جو وحی ہے تمنا سناؤں
دیا فرمان دھوئی تا کوئی پس و پیش ہویں سب جمع یاں بیگانہ و خویش
ہوئے درحال حضرت پاس حاضر عرب کے ہور عجم کے سب اکابر
جہاز اُشترانسوں بند کو ممبر فصاحت سوں پڑھے خطبہ پیمبر
کہے مج منسوں جیو ڈھنڈتا ہے دوری ہوا نزدیک ایام حضوری
مشام جاں میں بوئے وصل آتا خوشحالی سوں نہ تن میں جیو سماتا
مجھے رحلت کا ہوتا ہے اشارت ضرور ہے اب ادا کرنا رسالت
سو مج یوں حکم رب العالمیں ہے علی تیرا ازل سوں جانشیں ہے
مقرر کر اسے توں سروری پر بنی آدم ملک جن و پری پر
تیچھے دھرھات حیدر کا اچلائے بلند آواز سوں سبکوں سنائے
کہ مج بعد از تمارے ہمیں اولا علی مولا ہیں جن کا میں ہوں مولا
میرا جیو تم پو تھا تعظیم رکنا علی کا دیکھ سب تکریم رکتا
سبب ہے حق تعالی کی رضا کا محبت دل میں رکنا مرتضا کا
یونا سمجو تمیں نفس و ہوا سوں جکچ بولیا ہوں میں وحی خدا سوں
بزبان حضرت دعا کرنے اچاہات علی خاطر کیے سخی سوں مناجات

(بقیہ [illegible])

تبصرۂ کتب

از قاضی عبدالودود

مطالعۂ غالب از جناب میرزا جعفر علی خاں، اثر، صفحات ۱۱۲، قیمت عہ؍
ملنے کا پتا دانش محل امین الدولہ پارک لکھنؤ۔ مطالعۂ غالب میں جناب اثر نے غالب
و میر کا موازنہ کیا ہے، غالب کے کچھ اشعار کے مطالب پیش کئے ہیں اور ان کے
اردو اشعار کا انتخاب دیا ہے۔

(۱) "میر کے یہاں زبان و بیان کی گھلاوٹ قائم رہتی ہے، غالب کے یہاں
بعض اوقات فوت ہو جاتی ہے.. یہ سبب نہیں کہ غالب کے خیالات فلسفیانہ ہونے
کے سبب سے.. عام جادے سے ہٹ کر نظم ہوتے ہیں لہٰذا فارسی کی کڈھب
ثقیل یا نامانوس تراکیب کا استعمال ناگزیر ہو جاتا ہے.. میر.. نے غالب سے کہیں
زیادہ فلسفیانہ خیالات شعر کے قالب میں ڈھال دیے ہیں.. دونوں میں یہ فرق بھی
ہے کہ میر رومانوی شاعر تھا غالب کلاسی سسٹ۔ میر کی شاعری شخصیت کی آئینہ دار
ہے، غالب کی شاعری وہ ہے جس کو ڈرائیڈن "ابیجی میٹو پوئٹری اور رائٹنگ" سے
تعبیر کرتا ہے جس میں جذبات کا تقاضا نہیں ہوتا بلکہ غور و فکر سے وجود میں آتی ہے..
میر کی شاعری وجدان کی سر گردگی میں جذبات و واردات کی مصوری ہے۔ غالب
کو یہ کاوش رہتی تھی کہ اسلوب ادا میں جدت و ندرت پیدا کر سکتا کہ.. ہمعصر شعرا میں
ممتاز ہی نہ رہیں بلکہ ان پر سبقت لے جائیں.. بے ساختگی اور احساس "انا" میں

بیر ہے.. کلام میر میں ترکیب و معانی شیر و شکر ہیں اور کلام غالب میں تراکیب معانی پر چھائی ہوئی ہیں"۔ اس سے مجھے کامل اتفاق نہیں، مگر اس وقت اس سلسلے میں اتنا ہی لکھنے پر اکتفا کرتا ہوں۔

(۲) یادگار غالب کے علاوہ دیگر تذکروں میں درج ہے کہ "مومن اور غالب دونوں نے ناسخی رنگ اختیار کرنے کی کوشش کی مگر... ناکام رہے"۔ یادگار غالب میں غالب و مومن کی تقلید ناسخ کا مطلقاً ذکر نہیں۔

(۳) "غالب کے خطوط پڑھیے میر کے اشعار قلم برداشتہ لکھتے جاتے ہیں، اس کے کلام کا انتخاب کیا تھا اور یہ کام گہرے اور مسلسل مطالعے کے بغیر سرانجام نہیں ہو سکتا" غالب کے یہاں میر کا صرف ایک شعر آیا ہے اور وہ نہ کلیات میں ہے اور نہ کسی تذکرے میں، خدا جانے کس کا ہے۔ اسی طرح ایک مصرع بھی ہے، جو کلیات میر میں نہیں۔ جناب اثر کا یہ قول بھی محتاج ثبوت ہے کہ غالب نے میر کے کلام کا انتخاب کیا تھا۔

(۴) جناب اثر نے یہ دکھانے کے لیے کہ غالب کس حد تک میر سے متاثر تھے دونوں کے نو نو شعر دیے ہیں، مگر غالب کے بیشتر اشعار ایسے ہیں، جن کے متعلق یہ شبہہ بھی نہیں ہو سکتا کہ ان میں میر کے اشعار کا عکس نظر آتا ہے۔ غالب و میر کے چار چار شعر ملاحظہ ہوں:

دے وہ جس قدر ذلت ہم ہنسی میں ٹالیں گے	بارے آشنا نکلا ان کا پاسباں اپنا
نہ تھا کچھ تو خدا تھا کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا	ڈبویا مجھ کو ہونے نے نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا
لطافت بے کثافت جلوہ پیدا کر نہیں سکتی	چمن زنگار ہے آئینۂ باد بہاری کا
بازیچۂ اطفال ہے دنیا مرے آگے	ہوتا ہے شب و روز تماشا مرے آگے

ہوتا ہے یاں جہاں میں ہر روز و شب تماشا ‏ ‏ دیکھا جو خوب تو ہے دنیا عجب تماشا
ذلیل اس کی گلی میں میں تو ہیں آزردگی کیسی ‏ ‏ کہ رنجش تو وہاں ہووے جہاں ہو اعتبار اپنا
مری نمود نے مجھ کو کیا برابر خاک ‏ ‏ میں نقش پا کی طرح پائمال اپنا ہوں
عالم خاکی سے آدم کو جلا ہے ورنہ ‏ ‏ آئینہ تھا تو مگر قابل دیدار نہ تھا

(۵) جناب اثر نے میر کے چند اشعار دیے ہیں، جن کے متعلق ان کا دعویٰ ہے کہ کلام غالب سے "مماثل" ہیں۔ ان میں سے کچھ ضرور غالب کے رنگ کے ہیں، لیکن، ان کا یہ قول کہ "فارسی تراکیب.. کاو کاو، شیشہ بازی، سادہ و پرکار، ستم ظریف وغیرہ جن کے غالب مخترع سمجھے جاتے ہیں، سب میر کے یہاں موجود ہیں" صحیح نہیں، لیکن ان کے موجد نہ غالب ہیں نہ میر، یہ شعرائے فارسی کے یہاں ملتے ہیں۔ اور ان میں سے بعض تو کثیر الاستعمال ہیں۔

(۶) جناب اثر مدعی ہیں کہ میں نے اشعار غالب کے ایسے مطالب پیش کیے ہیں، جو دوسرے شارحین کی نظر سے اوجھل رہے ہیں۔ میں نے کلام غالب کی کم شرحیں دیکھی ہیں اور ظاہر ہے کہ اس صورت میں مجھ سے اس کی توقع نہیں کی جا سکتی کہ میں اس دعوے کی تصدیق یا تکذیب کروں، لیکن چونکہ خود جناب اثر نے کل شرحوں کا مطالعہ کرنے کے بعد یہ کہا ہے سوء ظن کی کوئی وجہ نہیں۔ ان مطالب میں سے بعض قطعاً قابل قبول نہیں، بعض غالب کے اشعار سے نکلتے ہیں، لیکن ساتھ ہی اور مطالب کی بھی گنجائش رہ جاتی ہے، اور بعض ایسے ہیں کہ انھیں دیکھ کر یقین ہو جاتا ہے کہ غالب کے ذہن میں خود یہی مطالب ہوں گے۔ جناب اثر کی سخن فہمی میں کچھ شبہ نہیں۔

(۷) جناب اثر نے اشعار غالب کا جو انتخاب ۸۳ صفحوں کا پیش کیا ہے،

اچھا ہے، لیکن یہ بالکل ظاہر ہے کہ ان کا انتخاب ہو یا کسی اور کا، یہ ممکن ہی نہیں کہ ہر شخص اس سے مطمئن ہو سکے۔ غالب کی غزل "آہ کو چاہیے اک عمر اثر ہوتے تک" الخ میں ہر جگہ "ہوتے" کی جگہ "ہونے" ہے۔ دیوان غالب کے کل نسخے جو خود ان کی زندگی میں شائع ہوئے تھے، اس کے شاہد ہیں کہ غالب نے "ہوتے" لکھا تھا۔

ولی گجراتی مصنفہ جناب ڈاکٹر سید ظہیر الدین مدنی، صفحات ۱۵۶ قیمت عہ شائع کردہ انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ بمبئی۔

ولی سے متعلق مضامین تو بہت سے لکھے گئے ہیں، لیکن ایک مستقل کتاب کی جس میں تمام امور پر ایک شخص نظر ڈالے کمی تھی، یہ ڈاکٹر مدنی کی کتاب کی اشاعت سے پوری ہو گئی ہے۔ ولی کے نام اور وطن کے متعلق جو اختلاف ہے اس کے فیصلے میں بعض دستاویزوں سے مدد لی گئی ہے، لیکن یہ ثابت نہیں کہ ان میں جس شخص کا نام آیا ہے وہ ولی ہی ہے۔ اس سے قطع نظر، وطن کے متعلق انھوں نے جو کچھ لکھا ہے، اس سے ان اصحاب کے دلائل کا ضعف اچھی طرح واضح ہوتا ہے جو اس پر مصر ہیں کہ ولی کا وطن اورنگ آباد ہے۔ اس کتاب میں ولی کی زبان سے بحث کی گئی ہے، لیکن بہت بہتر ہوتا کہ اگر ایک مکمل لفظ نامہ شامل کتاب ہوتا۔ ولی سے دلچسپی رکھنے والے اصحاب اس کا مطالعہ کریں تو مایوس نہ ہوں گے۔

JAMMU & KASHMIR UNIVERSITY LIBRARY
No. 40508
ALLAMA IQBAL LIBRARY